وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

PEPSI

MIRINDA

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۱ / ۲۳۹۳۱

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ـــــ ۳۴

شمارہ ـــــ ۱۲

دسمبر ۱۹۸۵ء

بطابق

ربیع الاول ۱۴۰۶ھ

زر سالانہ

۳۰ روپے

فی شمارہ ۳/- روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارہ تحریر

شیخ جمیل الرحمن

○

مولانا محمد سعید الرحمن علوی

○

حافظ عاکف سعید

○

مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن

لاہور فون ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

عرضِ احوال ——— ۳
جمیل الرحمٰن

• نظمِ دین اور سنتِ نبوی ——— ۷
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

• الھدیٰ (نشست نمبر ۲۶، ۲۷، ۲۸) ——— ۱۹
اثباتِ آخرت سورہ قیامہ کی روشنی میں
ڈاکٹر اسرار احمد

• غزوۂ بدر: مسلح تصادم کا آغاز ——— ۴۹
بسلسلہ: اسلامی انقلاب: مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب نمبر ۵)
ڈاکٹر اسرار احمد

• مسلم پرسنل لا کی صحیح نوعیت و اہمیت ——— ۷۵
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

• دل افگندیم بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا (۳) ——— ۸۵
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

• رفتارِ کار ——— ۹۹
سید واحد علی رضوی

جمیل الرحمٰن

عرضِ احوال

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

بفضلہٖ تعالیٰ وعونہٖ "میثاق" بابت دسمبر ۸۵ء مطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۶ھ پیشِ خدمت ہے۔ اس شمارہ سے تحریک تجدیدِ ایمان، توبہ، تجدیدِ عہد یعنی تنظیم اسلامی کے اس نقیب اور دعوت رجوع الی القرآن کے اس ترجمان کی چونتیسویں جلد اختتام پذیر ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ العزیز جنوری ۱۹۸۶ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ سے "میثاق" کی پینتیسویں جلد کا آغاز ہوگا۔

گذشتہ شمارے میں تذکرہ کیا گیا تھا کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ امیر تنظیم اسلامی عمرہ اور طائف میں چند روز بغرضِ آرام تشریف لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ موصوف ۱۱ اکتوبر کو Visit-Viza پر سعودی عرب تشریف لے گئے جہاں سے ۲۱ اکتوبر کو مراجعت ہوئی۔ امیر محترم کا یہ بھی ارادہ تھا کہ عمرہ کی سعادت سے شاد کام ہونے کے بعد اپنے طائف کے قیام کے دوران موصوف اپنی ان مفصّل و طویل تقاریر کی روشنی میں جو انہوں نے "استحکامِ پاکستان" کے موضوع پر اگست، ستمبر و اکتوبر ۸۵ء میں مختلف اسالیب اور زاویوں سے 'اسلام آباد کمیونٹی سنٹر'، 'شام الہدیٰ' لاہور، اور 'شام الہدیٰ' کراچی کی ماہانہ مجالس میں ارشاد فرمائی تھیں ایک مبسوط و مدلّل کتاب بھی تحریر فرمائیں گے۔

لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ امیر محترم کا طائف میں قیام تین دن سے زیادہ نہ رہ سکا۔ چونکہ سعودی عرب میں دعوت رجوع الی القرآن کے داعی اور تنظیم اسلامی کے امیر کی تشریف آوری کی خبر ایسی نہیں تھی جو پوشیدہ رہ سکتی۔ چنانچہ تحریک و دعوت کے رفقاء متفقین و متوسّلین نے جو وہاں مختلف شہروں میں مقیم ہیں اپنے اپنے شہروں میں امیر محترم کے دروس و خطابات کے پروگرام بنا رکھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب دعوت و تبلیغ کے ان مواقع کو جو خالصتہً فضل و مشیّتِ الٰہی سے مہیا ہو رہے تھے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا امیر محترم نے دعوت و تبلیغ کی خاطر اپنے آرام کو تج دیا اور جدّہ، مکہ مکرمہ، طائف، ریاض، الخبر، دھران اور مدینہ منورہ میں محدود نشستوں اور بڑے اجتماعات میں دروس و خطابات کا سلسلہ جاری رکھا۔ دھران میں تو ۳۰ اکتوبر کا پورا دن نہ صرف مختلف دینی مصروفیتوں میں گزرا بلکہ ایسی صورت درپیش آئی کہ بعد عشاء قریباً ڈھائی گھنٹہ کا خطاب ارشاد فرمایا اور اس سے فارغ ہو کر جلد از جلد تیاری کر کے ائرپورٹ پہنچے چونکہ اسی روز ایک بجے شب کی فلائٹ سے روانہ ہو کر ۳۱ اکتوبر کی صبح کو

لاہور پہنچنا تھا۔

البتہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے طائف کے دو تین دن کے قیام کے دوران اور فرصت کے ان اوقات میں جو مختلف مقامات پر امیر محترم کو میسر آئے انہوں نے 'استحکام پاکستان' کی تقاریر کی روشنی میں اس موضوع پر پیش نظر کتاب کا مکمل مقدمہ تحریر فرمالیا۔ مزید یہ کہ اس کا ایک بڑا حصہ بھی ضبط تحریر میں آگیا۔ توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز کتاب کا بقیہ حصہ بھی جنوری ۱۹۸۶ء کے اوائل تک رقم ہو جائے گا۔ اور کتاب مکمل ہو جائے گی۔

استحکام پاکستان کے موضوع پر امیر محترم کی اس مبسوط و مدلل تحریر کے متعلق کوشش ہو رہی ہے کہ اس کو کتابی شکل میں شائع کرنے سے قبل ملک کے کثیر الاشاعت اور بین الاقوامی سطح پر مشہور و معروف ایک روزنامہ میں بالاقساط شائع کرانے کا انتظام کیا جائے۔ الحمدللہ اس کوشش کے مشکور ہونے کی صورت پیدا ہو چلی ہے۔ آگے جو اللہ کو منظور ہو۔ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہ

'میثاق' کے جنوری ۱۹۸۶ء کے شمارے سے اللہ نے چاہا تو اس تحریر کا قسط وار اشاعت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ان شماروں کو جن میں یہ تحریر بالاقساط شائع ہوگی، معمول سے زیادہ طبع کرایا جائے گا تاکہ اس کو ملک کے نامور علماء کرام، سیاست دان اور حلقۂ دانشوران تک پہنچایا جا سکے قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ ابھی سے مصمم ارادہ کرلیں کہ وہ اپنے حلقۂ تعارف میں اہل فکر و نظر تک ان شماروں کو پہنچانے کی سعی بلیغ کر کے تعاون علی البر فرمائیں گے۔ خاص طور پر تنظیم اسلامی کے رفقاء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان شماروں کو مذکورہ بالا حلقوں میں زیادہ سے زیادہ پہنچانے کی کوشش کریں۔

علاقائی اجتماعات کے ضمن میں الحمدللہ تنظیم اسلامی کا چوتھا دعوتی و تربیتی اجتماع ۸، نومبر ۸۵ء سے ۱۰ نومبر ۸۵ء تک حیدر آباد میں جو صوبہ سندھ کا دوسرا اور پورے پاکستان کا چوتھا بڑا شہر ہے منعقد ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت سے موانع کے باوجود یہ اجتماع کافی کامیاب رہا۔ تربیتی پروگرام کے علاوہ اس موقع پر امیر محترم کے دو مقامات پر خطابات عام ہوئے۔ دونوں اجتماعات حاضری کے اعتبار سے کسی عظیم سیاسی جلسۂ عام کی کیفیات کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ لیکن متانت اور سنجیدگی کے لحاظ سے یہ جلسے نہایت پرسکون اور وقار دینی اجتماع کے جملہ محاسن کے حامل تھے۔ کیا مجال کہ ان اجتماعات میں کوئی نعرہ بازی یا افراتفری ہوئی ہو۔ امیر محترم نے ان اجتماع کے لئے موضوع "اسلامی انقلاب کیا، کیوں اور کیسے؟" مقرر فرمایا تھا۔ پہلے اجتماع میں "کیا اور کیوں؟" پر قریباً تین گھنٹے تقریر جاری رہی اور دوسرے اجتماع میں قریباً ڈھائی گھنٹے کے خطاب میں "کیسے؟"

کی وضاحت ہوئی یعنی پاکستان میں اسلامی انقلاب کے منہاج کو مفصّل و مدلّل طور پہ بیان کیا گیا — — ان شاء اللہ العزیز پانچویں علاقائی دعوتی و تربیتی اجتماع کا انعقاد فروری ۸۶ء کے آخری عشرہ میں ملتان میں ہوگا۔ مقام اور تاریخوں کا اعلان جنوری ۸۶ء کے 'میثاق' میں کر دیا جائے گا۔

امیرِ محترم ۲۰ نومبر ۸۵ء کو عزیزم حافظ عاکف سعید سلمہ کے ہمراہ بارہ روز کے دعوتی دورے پر بھارت تشریف لے گئے ہیں جہاں سے توقع ہے کہ ان شاء اللہ ۳ دسمبر ۸۵ کو مراجعت ہوگی۔ بھارت میں امیرِ محترم کا زیادہ تر قیام حیدر آباد دکن میں رہے گا اور وہیں موصوف سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر مختلف مقامات پر خطابات ارشاد فرمائیں گے۔ موصوف کا دہلی اور لکھنؤ میں بھی ایک دو دن ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ بھارت سے مراجعت کے بعد امیرِ محترم ۹ دسمبر کی شام کو کراچی سے ان شاء اللہ ابوظہبی تشریف لے جائیں گے۔ جہاں سے ۲۰ دسمبر کو کراچی مراجعت ہوگی اور توقع ہے کہ کراچی میں ۲۵ دسمبر تک قیام رہے گا۔ جہاں ۲۲ دسمبر کو شام الہدیٰ کی ماہانہ نشست کے علاوہ امید ہے کہ دو تین درس یا خطابات کے پروگرام بھی ہوں گے —— ہوسکتا ہے کہ ایک سہ روزہ تربیتی پروگرام بھی مرتب ہو جائے۔

یہ امر نہایت دلی صدمہ کا باعث ہے کہ مارچ ۸۵ء کے بعد سے ملک کے بعض دینی جریدوں نے تنظیم اسلامی کی دعوت، بالخصوص امیرِ محترم کی شخصیت کو مجروح کرنے کا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے۔ تعمیری تنقید اور فروگذاشتوں پر توجہ دلانا بالکل علیحدہ بات ہے اور یہ امر نہ صرف مطلوب ہے بلکہ مستحسن ہے لیکن طنز و تعریض کا انداز اختیار کرنا اور مسائل کو اپنی طرف سے غلط مفاہیم و معانی پہنا کر ان پہ جارحانہ اور غیر محتاط انداز سے تلخ و تند تنقیدیں شائع کرنا ان دینی جرائد کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہے۔ اس ضمن میں نومبر ۸۵ء کے 'حکمتِ قرآن' کے شمارہ میں محترم قاری سعید الرحمٰن دامت برکاتہم کے قلم سے ایک نہایت مؤثر تحریر 'حکم و عبر' کے مستقل عنوان کے تحت رقم ہو کر شائع ہوئی ہے جو نہایت خلوص و اخلاص اور نصح و موعظت پر مبنی ہے۔ ہم قارئین کرام 'میثاق' کو اس مضمون کے مطالعہ کی خصوصی طور پہ دعوت دیتے ہیں نیز دینی جرائد کے معاصرین کے ارباب اختیار سے نہایت دردمندی کے ساتھ اس مضمون کے مطالعہ کی درخواست کے ساتھ یہ التجا بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی فرمائیں — جو انداز اختیار کیا جا رہا ہے اس کے متعلق ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ وہ دین کے لئے کسی اعتبار سے بھی مفید نہیں ہے بلکہ مضر ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ، وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ!

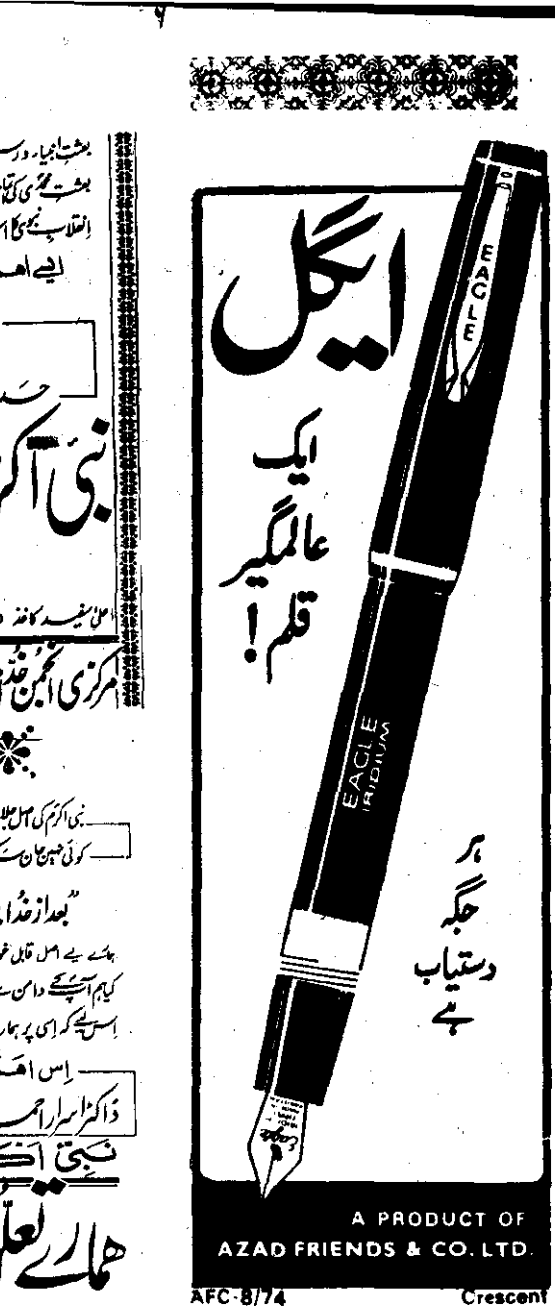

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ـــــ اور
بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ـــــ نیز
انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ـــــ
ایسے اہم موضوعات پر
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف
نبی اکرم کا مقصدِ بعثت
کا مطالعہ کیجیے
اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۴ روپے
مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

نبی اکرم کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ
"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"
ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:ـــــ
کیا ہم آپ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں ؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے ـــــ
اس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں
کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اسے پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے
ہدیۂ قیمت: تین روپے۔ تبلیغی مقصد کیلیے یک صد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا:

نظمِ دین اور سُنّتِ نبوی

جلوسِ میلاد جیسی بدعات سُنّتِ رسول کی واضح نفی ہے

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

یہ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کہ مسلمان قوم کی عزّت کا راز صرف اور صرف اسلام میں ہے۔ امیر المومنین سیدنا عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے :

اِنَّا کُنَّا اَذَلَّ قَوْمٍ فَاَعَزَّنَا اللّٰہُ بِالْاِسْلَامِ فَمَھْمَا نَطْلُبُ الْعِزَّ بِغَیْرِ مَا اَعَزَّنَا اللّٰہُ بِہٖ اَذَلَّنَا اللّٰہُ۔

(مستدرک حاکم، ص ۶۲ ج ۱)

ہم ایک ایسی قوم تھے جو ذلّت و خواری کا شکار تھی لیکن اللہ تبارک و تعالےٰ نے دینِ اسلام کے ذریعہ ہمیں عزّت عطا فرمائی۔ اب جب ہم کسی ایسی چیز کے ذریعہ عزّت کے حصول کی کوشش کریں گے، جس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں عزّت نہیں دی تو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل و رُسوا کر کے چھوڑ دے گا۔

گویا "محدّثِ اُمّت" سیدنا فاروق رضؓ نے صرف اسی حقیقتِ کبریٰ کی طرف توجّہ نہیں دلائی کہ ہماری عزّت کا راز اسلام میں ہے بلکہ اس طرف بھی توجّہ دلادی کہ اگر کبھی اس "حقیقی سببِ عزّت" کے بجائے کسی دوسرے "سببِ عزّت" کی طرف نگاہ اُٹھی تو پھر "عزّتِ سادات" گنوا کر رہ جائیں گے اور حال وہ ہو گا کہ ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

غالباً ہی نہیں بلکہ یقیناً یہی احساس تھا جس کے پیشِ نظر پہلی صدی کی عظیم دینی اور حکومتی شخصیت سیدنا عمر بن عبد العزیز رضؒ نے اپنی ایک تقریر میں توجّہ دلائی تھی کہ :

"حضور اکرم محمد عربی علیہ السلام کے بعد نبی کوئی نہیں اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید کے بعد کوئی کتاب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو حلال کرنا تھا وہ ہو گیا اور اب قیامت تک اس میں تبدیلی نہ آئے گی۔ اسی طرح حرام ہونے والی اشیاء کا فیصلہ ہو گیا اور یہ بھی اٹل فیصلہ ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔ میں تو احکامِ الٰہی نافذ کرنے والا ہوں۔"

اور آگے اسی کو مزید اس طرح بیان کیا:

"وَاِنِّیْ لَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ وَلٰکِنِّیْ مُتَّبِعٌ" — میں بدعتی نہیں متبع سنت ہوں۔" (الاعتصام للشاطبی صہ ۱۰۱ ج ۱)

جس کا معنی صاف لفظوں میں یہ ہے کہ ایک مسلمان پابند ہے تو اس بات کا کہ وہ دین کی حقیقت کو سامنے رکھے — قرآن و سنت پر اُس کی نگاہ رہے اور اُمت کے اہلِ صلاح و تقویٰ کی وہ تعبیرات و تشریحات سامنے رہیں، جو قرآن و سنت کے سلسلے میں منقول ہیں — اور ظاہر ہے کہ اس میں اولیت حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کو حاصل ہے — صحابہ کرام علیہم الرضوان کا ذکر محض بر بنائے عقیدت نہیں بلکہ ان کی اِس حیثیت و مقام کو خود اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کیا۔ طوالت سے بچتے ہوئے محض ایک ارشاد نبوی کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں،

"بنی اسرائیل بہتّر فرقوں میں بٹ چکے تھے اور میری اُمت تہتّر فرقوں میں منقسم ہو جائے گی، سب کے سب فرقے دوزخ میں جائیں گے۔ مگر صرف ایک فرقہ —" لوگوں نے اس ایک فرقہ کی بابت پوچھا تو ارشاد فرمایا: "مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ۔ وہ فرقہ جس نے وہ کام کیے جو میں نے اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیے۔"

(ترمذی صہ ۸۹ ج ۲ — مستدرک صہ ۱۲۹ ج ۱ — مشکوٰۃ صہ ۳۰ ج ۱)

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق حضرت ملا علی القاری الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وہ سب کے سب مطلقاً عادل اور ثقہ ہیں۔"

(مرقاۃ صہ ۵۱۷ ج ۱ مطبوعہ ملتان)

یہی بات امام ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ :

فَاِنَّهُمْ كُلَّهُمْ عُدُوْلٌ (اسد الغابۃ صہ ۲ ج ۱)

تقریر الاصول (صہ ۲۶۰ ج ۲) فواتح الرحموت (صہ ۱۵۶ ج ۱) اور مسامرہ صہ ۱۵۸ جیسی معتمد کتب میں صحابہ کرام کے نقد و جرح سے بالاتر ہونے پر تفصیلی گفتگو ہے اور بقول ابن حجر عسقلانی الشافعی اللہ تعالیٰ :

" اہل سنت اس بات پر متفق ہیں کہ حضرات صحابہ رضہ کا اجماع حجت ہے"

(فتح الباری صہ ۲۶۶ ج ۳)

حکیم امت حضرت الامام الشاہ ولی اللہ الدہلوی قدس سرہٗ اسی اصولی مسئلہ سے متعلق اپنی مایہ ناز کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں :

" میں کہتا ہوں کہ فرقہ ناجیہ صرف وہی ہے جو عقیدہ اور عمل دونوں میں کتاب و سنت کی اور جس پر جمہور صحابہ کرام رضہ اور تابعین کاربند تھے، پیروی کرے ـــــ اور غیر ناجی ہر وہ فرقہ ہے، جس نے سلف کے عقیدہ کے خلاف کوئی عقیدہ یا اُن کے عمل کے خلاف کوئی عمل اختیار کیا۔"

(حجۃ اللہ البالغہ صہ ۱۷۰ ج مطبوعہ لاہور)

قرآن و سنت کی واضح رہنمائی اور اسلاف کے بتلائے ہوئے عقیدہ و عمل کے خلاف جو کاوش و کوشش ہوتی ہے، اسے دین اسلام کی ذمہ دار شخصیات کس قدر بُرا سمجھتی ہیں اس کا اندازہ ان ارشادات سے لگائیں :

" جس نے اسلام میں کوئی بدعت نکالی جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے، ـــ تو گویا اس نے یہ گمان کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم نے ادائیگیٔ رسالت کے سلسلہ میں خیانت کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ پس جو چیز وقت دین نہ تھی آج بھی ہرگز دین نہیں ہوسکتی۔"

(ارشاد۔ امام دار ہجرت سیدنا امام مالکؒ ۔ الاعتصام صہ ۶۴ ج ۱، صہ ۱۵۰ ج ۲ للشاطبیؒ)

علامہ حسام الدین علی متقی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

" بدعتی اپنے عمل سے اسلاف پر طعن کرتا ہے کہ انہوں نے گویا پورا دین

بیان نہیں کیا۔ نبی علیہ السلام پر، کہ آپ نے (فلاں فلاں کا حق) بیان نہیں کیا اور خود اللہ تعالےٰ پر کہ اس نے شریعت مکمل نہیں کی۔"

(بحوالہ "راہِ سنّت" صہ ۱۶-۱۷)

حضرت الامام الشیخ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ اہلِ بدعت کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دے اور انہیں اس پر چلائے۔ وہ نہیں جانتے کہ دین تو اِن بدعات و محدثات سے قبل مکمل ہو چکا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت تمام ہو چکی ــــ پس اب دین کا کمال ان بدعات سے تلاش کرنا درحقیقت آیتِ تکمیلِ دین کے انکار کے مترادف ہے۔"

(مکتوبات حصّہ چہارم صہ ۹۴ مطبوعہ امرتسر)

اور یہی بات ملّا علی قاری اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"ہمیں دین کی تکمیل میں کسی ایسے امر کی حاجت اور ضرورت نہیں جو کتاب و سنّت سے خارج ہو۔" (شرح فقہ اکبر صہ ۱۰)

بدعت سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے اور بدعتی کی جو مخصوص نفسیات ہیں، انہی کے سبب حضور خاتم المعصومین محمد عربی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلّم نے فرمایا:

مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِّنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ۔

(مسند احمد صہ ۱۰۵ ج ۴۔ مشکوٰۃ صہ ۳۱ ج ۱)

کوئی قوم بدعت ایجاد نہیں کرے گی مگر اسی کی مقدار میں سُنّت اس سے اُٹھا لی جائے گی۔ پس سنّت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت کے ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

اور ایک جلیل المرتبت تابعی حضرت حسّان رحمہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں:

"کوئی قوم دنیا میں بدعت نہیں نکالے گی مگر اللہ تعالیٰ اتنی ہی مقدار میں سُنّت ان سے اُٹھا لے گا اور پھر قیامت تک وہ سنّت ان کو واپس نہ دے گا۔" (دارمی صہ ۲۱)

یہ ہے بدعت کا واضح نقصان کہ اس کے سبب "سنّت سے محرومی" کا وبال بھگتنا پڑتا ہے۔ اور بعض دوسری روایات میں حضور اکرم علیہ السلام نے "کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ" ہر بدعت کو گمراہی اور ہر گمراہی کو جہنّم کا سبب بتلایا۔ جو لوگ یہ مشغلہ اور کاروبار کرتے ہیں وہ

حضور اکرم علیہ السلام کے ارشاد کے تحت" انسانی شکلوں میں شیطان ہیں۔

امام مسلم قدس سرہ روایت نقل کرتے ہیں ـــــ جس کے راوی حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں :

" میرے بعد کچھ مقتدا اور پیشوا ایسے ہوں گے جو میری سیرت و اسوہ پر نہیں چلیں گے اور میری سنت پر عمل نہیں کریں گے ان میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جن کے دل شیطانوں کے دل ہوں گے مگر شکل و صورت انسانی ہو گی ـ"

(مسلم صہ ۱۲۷ ج ۲ مجتبائی دہلی)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ " نظم و انتظام دین " کے لیے کتنی صحیح بات ارشاد فرماتے ہیں : اقول انتظام الدین یتوقف علی اتباع سنن النبی (حجۃ اللہ البالغہ صہ ۱ ج ۱)

" نظم دینی اس پر موقوف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ واصحابہ وسلم کی سنتوں پر عمل کیا جائے ـ"

بدعت، جس کی نحوست کے سبب انسان دوزخ کا مستحق ہوتا ہے، سنت کے نور سے محروم ہوتا ہے، انسانی شکل میں شیطان بن جاتا ہے۔ اعتماد علی السلف کی دولت سے محروم ہوجاتا ہے اور عملاً تکمیل دین کا منکر بنتا ہے ـــــ وہ ہے کیا؟ اس موقعہ پر لغوی بحث سے قطع نظر کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم ذمہ دار محدثین و ائمہ دین کے حوالہ سے اس کی شرعی تعریف پیش کرتے ہیں :

حافظ عینی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح بخاری میں فرماتے ہیں :

" وہ نو ایجاد چیز جو زمانۂ نبوت میں نہ تھی ـ " (عمدۃ القاری صہ ۳۵۶ ج ۵)

حافظ ابن حجر عسقلانی الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں :

" کسی سابق مثال اور نمونہ کے بغیر ایجاد شدہ چیز ـــــ شریعت میں اس کا اطلاق سنت کے بالمقابل ہوتا ہے ـ فلہذا وہ مذموم اور بری ہے ـ"

(فتح الباری صہ ۲۱۹ ج ۴)

علامہ مرتضیٰ الزبیدی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں :

" اصول شریعت کے خلاف، سنت کے ناموافق" (تاج العروس صہ ۲۷ ج ۵)

حافظ ابن رجب حنبلی قدس سرہ کہتے ہیں :

"جس کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو۔ جو اس پر دلالت کرے۔"

(جامع العلوم والحکم ص۱۹۳)

الجنۃ ص۱۰۹ پر یہی تعریف علامہ معین بن صفی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھی:

علامہ ابو اسحاق غرناطی رحمہ اللہ تعالیٰ "بدعتِ شرعی" کی جامع مانع تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں

" وہ دین کے اندر اختراع کیا ہوا ایسا طریقہ ہے جو شریعت کے مشابہ ہے
اور جس پر عمل پیرا ہونے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مبالغہ کا قصد ہوتا
ہے۔" (الاعتصام للشاطبی ج ص۳ ج ۱)

افسوس یہ ہے کہ بدعت پسند اور بدعت کی رسیا طبائع نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایک قول کی بنیاد پر بدعت کی تقسیم شروع کر دی اور بعض بدعات کو "بدعتِ حسنہ" کہنا شروع کر دیا۔

تراویح کے متعلق قارئین جانتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم نے تین دن تو پڑھیں لیکن پھر اہتمام ترک کر دیا جس کا سبب یہ ارشاد فرمایا کہ:

"مجھے ڈر ہوا کہ تم پر یہ فرض نہ کر دی جائیں۔" (مشکوٰۃ ص۱۰۶ مطبع گلزار محمدی لاہور)

پھر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ تا آں کہ حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "لو جمعتُ ھؤلاء علی قارئٍ واحدٍ لکان امثل" کے داعیہ سے عزم فرما کر سب کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جمع کر دیا۔ دوسری شب جب اس اجتماعیت کو دیکھا "والنّاس یصلّون بصلاۃ قارئھم" تو فرمایا نعمت البدعۃ ھذہ (مشکوٰۃ ص۱۱۵) نورِ سنت سے محروم لوگوں نے اس کی آڑ میں "بدعتِ حسنہ" کا ہنگامہ گرم کر کے روحِ دین و حقیقتِ اسلام کو غارت کرنے کی سعیٔ نامسعود کی۔ (ہداہم اللہ تعالیٰ) حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ تراویح کا عمل اجتماعی طور پر خود رسالت مآب علیہ السلام کے دور میں ہوا۔ ایک خاص مصلحت سے پھر اسے موقوف کیا گیا۔ تاہم لوگ اپنے طور پر پڑھتے رہے حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور اسی طرح گذر گیا کہ اس میں امت کو شدید قسم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ حتیٰ کہ دَورِ فاروقی آ گیا، جس شب آپ نے "جمع علی القاری" کی خواہش و ارادہ ظاہر کیا، اس شب بھی لوگ مشغولِ تراویح تھے، فرداً فرداً بھی، اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں بھی، جیسا کہ اسی روایت میں تصریح ہے۔

تو اس تفصیل کے بعد یہ بدعت شرعی کہاں رہی ؟ اور یہی بات حضرت امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ارشاد سے جو یہ سمجھتا ہے، وہ احمق ہے (دیکھیں حاشیہ مشکوٰۃ صـ ۱۱۵ مطبوعہ کراچی) پھر بات کیا ہوئی ـــــ اصل یہ ہے کہ بدعت کی تقسیم "حسنہ اور سیئہ" میں کرنا ہی غلط ہے۔ ہاں "لغوی اور شرعی" کا عنوان بالکل صحیح ہے۔ لغوی ہر نو ایجاد کو کہتے ہیں۔ وہ عبادت کے قبیل سے ہو یا عادت کے قبیل سے ـــ اس کی قسمیں واجب، مندوب، حرام، مکروہ اور مباح بیان کی گئی ہیں، جن کی تفصیل کا وقت نہیں۔ اس کے بالمقابل بدعت شرعی ہے، جس سے متعلق شارع کی اجازت صراحتہً، دلالتہً، اشارۃً کسی طرح نہ ہو، اسی کو ضلالہ، جہنم میں دخول کا باعث اور رفع سنت کا سبب وغیرہ کہا گیا ـــــ "صاحب الجنۃ" کہتے ہیں :

"بدعت دو قسم ہیں لغوی، شرعی ـــــ شرعی وہ ہے جو طاعت کی مد میں کسی مشروع امر پر زیادت (یا کمی) کی جائے ـــــ اس پر شارع کا قول ہو نہ فعل، صراحت ہو نہ اشارہ ـــ یہی بدعت ضلالہ ہے" صـ ۱۱

اس سلسلے میں مزید بحث کے لیے ملاحظہ فرمائیں :

ارشاد الساری شرح بخاری للعلامہ قسطلانی رحمہ اللہ تعالیٰ صـ ۲۴۴ ج ۱، عمدۃ القاری صـ ۳۵۶ ج ۵، نووی شرح مسلم للامام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ صـ ۲۸۵ ج ۱، مدخل صـ ۲۵۷ ج ۲، فتح الباری صـ ۲۱۹ ج ۴، ارشاد امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ منقول منہاج السنۃ لابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ صـ ۲۲۸ ج ۲

یہی وجہ ہے کہ الف ثانی کے مجدد کبیر حضرت الامام الشیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں

ع چیزے کہ مردود باشد حسن از کجا پیدا کند (مکتوبات صـ ۳ ج ۳)

"جو چیز حضور علیہ السلام کے ارشاد کے تحت "مردود" ہے، وہ حسن کہاں سے پیدا کرے گی ؟"

بدقسمتی یہ ہے کہ "اہل بدعت" اپنی ہر خرافات کے لیے دلائل کا انبار لگانے کی فکر کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"تم کوئی ایسا مبتدع نہ پاؤ گے جو ملت سے وابستگی کا مدعی ہو مگر یہ کہ وہ اپنی بدعت پر کسی شرعی دلیل سے ضرور استشہاد کرے گا اور اس طرح

اس کو اپنی عقل اور خواہش کے مطابق بنالے گا۔" (الاعتصام ص۱۴۱ ج ۱)

اس قسم کی بات حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے (مکتوبات حصہ سوم ص۸) فرمائی کہ بدعت پسند طبائع بظاہر ہتھیاروں سے لیس ہو کر لوگوں کو قائل کرنے کی فکر و کوشش کرتی ہیں — لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح بے دینی، دین اور بدعت، سنت نہیں بن جاتی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اسی وجہ سے ایک بہت قیمتی نصیحت فرماتے ہیں (جس کا ترجمہ ہے)

"میں تجھے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کے حکم کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرنے نیز اس کے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنے کی وصیت کرتا ہوں — اور اس کی وصیت کرتا ہوں کہ اہل بدعت نے جو بدعتیں ایجاد کی ہیں، ان کو ترک کرنا جبکہ سنت اس سے قبل جاری ہے اور سنت کی موجودگی میں بدعت کی ایجاد کی آخر مصیبت کیا ہے؟ (ضرورت کیا ہے؟) سنت کو مضبوطی سے پکڑنا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے سنت حفاظت کا ذریعہ ہے اور اچھی طرح جان لے کہ لوگوں نے جو بدعت ایجاد کی ہے، اس سے قبل ہی وہ چیز گذر چکی ہے جو اس پر دلیل ہو سکتی تھی یا اس میں عبرت ہو سکتی تھی۔ کیونکہ سنت ان پاک نفوس کی طرف سے آئی ہے، جنہوں نے اس کے خلاف خطاء، لغزش، حماقت، اور تعمق کو بغور دیکھ لیا تھا۔ اور اس کو اختیار نہ کیا تو بھی صرف اس چیز پر راضی رہ، جس پر قوم (صحابہ و اسلاف) راضی ہو چکی ہے۔ کیونکہ انہوں نے علم پر اطلاع پائی اور دور رس نگاہ سے دیکھ کر بدعت سے اجتناب کیا اور البتہ وہ معاملات کی تہ تک پہنچنے پر قوی تھے اور جس حالت پر وہ تھے وہ افضل ترین حالت تھی، سو اگر ہدایت وہ ہے جس پر تم گامزن ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ان سے (اسلاف) فضیلت میں بڑھ گئے۔" (ابوداؤد — ص ۲۷۷ ج ۲)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس قیمتی نصیحت کے بعد مزید ضرورت کلام نہیں رہتی۔ تاہم علماء و فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی احتیاط اور حزم نے ہمارے لیے جو موتی

جمع کیے ہیں، ان میں سے ایک کا ذکر بے حد ضروری ہے، اور وہ یہ کہ جب کسی چیز کے سنّت یا بدعت ہونے میں اشتباہ کی کیفیت ہو تو پھر ایک مسلمان کیا کرے ؟ کتنا نازک اور باریک سوال ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ ہمارے اسلاف کی قبروں کو منوّر فرمائے انہوں نے خوب خوب رہنمائی کی۔ حضور علیہ السلام نے دل میں کھٹک بننے والی چیز کو گناہ سے تشبیہہ دی۔ اگرچہ نام کے مفتی اس کے جواز کا فتویٰ بھی دے دیں (مشکوٰۃ صہ ۲۴۲ ج ۱) اور بخاری صہ ۱۳ ج ۱ میں "مشتبہات میں پڑنے سے روکا اور فرمایا۔

" جو اِن سے بچ گیا اس نے اپنا دین بھی بچالیا اور عزّت بھی بچالی۔"

انہی ارشادات کی روشنی میں فقہا فرماتے ہیں :

" کوئی حکم سنّت و بدعت کے درمیان دائر ہو تو اس کا ترک ضروری ہے"

(علّامہ برکلی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ بحوالہ "راہِ سنّت" صہ ۱۵۰)

یہی بات عالمگیری صہ ۱۷۹ ج ۱، شامی صہ ۶۰۰ ج ۱، مجالس الابرار صہ ۱۲۹، مکتوبات شیخ عبدالحق محدث دہلوی برحاشیہ اخبارالاخیار صہ ۱۰ اور بحرالرائق صہ ۱۶۵ ج ۱ پر ہے ـــــ گویا اس قدر احتیاط کی ضرورت ہے۔

اِن تفصیلات کے بعد ذرا اس طرف توجّہ فرمائیں کہ ماہِ ربیع الاوّل جس میں حضور سرورِ کائنات علیہ السلام کی ولادت، وفات اور ہجرت کے واقعات پیش آئے، اس میں "مدعیانِ اسلام" کیا حرکات کرتے ہیں ؟ اور جو کچھ کرتے ہیں آیا وہ دین ہے ؟ سنّت و طریقِ نبوّت ہے ؟ آثارِ صحابہ رض سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے ؟ حاشاللہ ! سب سے بڑا ستم تو یہ ہے کہ تحقیقی روایات کے مطابق ولادت باسعادت محمدیؐ ۹ ربیع الاوّل روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء ہے (سیرت النبی صہ ۱۷۱ ج ۱ مطبوعہ اعظم گڑھ) اور وفات یقیناً ۱۲ کو ہے ـــــ لیکن وہ غم و اندوہ کا دن "ولادت" کا دن ہی قرار نہ پایا بلکہ سرکارِ دوعالم علیہ السّلام کی واضح تعلیمات کے علی الرغم "عید" کا دن کہلایا۔ مشکوٰۃ صہ ۱۱۸ پر تصریحات ہیں کہ بطور عید بس " الفطر اور الاضحےٰ " کے دو ہی ایّام ہیں لیکن وائے برحال ما کہ اس امامِ ہدیٰ، خاتم الانبیاء والمعصومین ، مقتدائے کائنات علیہم السّلام کی تعلیم کے علی الرغم ہم نے ایک "تیسری عید" کا اہتمام کرڈالا پھر اس کے لیے حکومت سے لے کر علماء و صلحاء تک نے جس طرح کا رویّہ اختیار کیا ،

وہ اتنا المناک ہے کہ ڈر لگتا ہے کہ ہم عتابِ الٰہی کا شکار ہو کر روزِ محشر شافع محشر کی شفاعت سے محروم نہ ہو جائیں۔ حضورِ اکرم رحمتِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر تو مندوب ہے جیسا کہ فقیہہ عصر مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فتاویٰ رشیدیہ میں صـ۱۰۲ ج ۱ و صـ۱۱۱ پر تصریح کی ہے لیکن جو کچھ ادھر ہے وہ کیا ہے — افسوس کہ اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔

خیر القرون کے مقدس ادوار سے بھی صدیوں بعد ۶۰۴ھ میں "موصل" کے ایک حکمران مظفر الدین کوکری بن اربل (م ۶۳۰ھ) نے یہ دھندا شروع کیا — یہ ذات شریف کون تھی۔ فضول خرچ بادشاہ۔ ہر کس و ناکس کو "اجتہاد" کی ترغیب دے کر اس پر عمل کی تلقین کرنے والا۔ پہلا شخص جس نے میلاد کی بدعت گھڑی۔

(العقول المعتمد بحوالہ "راہِ سنت" صـ۱۶۲)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ "دول الاسلام صـ۱۰۳ ج ۲ پر لکھتے ہیں:

"ہر سال اس تقریبِ میلاد پر تین لاکھ روپیہ خرچ کرتا۔"

جس "دنیا پرست مولوی" نے اسے اس کام پر لگایا اس کا نام "عمر بن دحیہ ابو الخطاب" تھا جو ۶۳۳ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ ایک ہزار پونڈ کا انعام اس کے جواز کے سلسلے میں مواد فراہم کرنے پر اُسے ملا۔" (دول الاسلام۔ صـ ۱۰۴ ج ۲)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

"یہ مولوی ائمہ دین اور سلف کی شان میں بہت گستاخی کرتا۔ گندی زبان کا مالک، احمق، متکبر، دین کے کاموں میں حد درجہ سست اور بے پروا تھا۔" (لسان المیزان صـ۲۹۶ ج ۴)

اور حافظ ہی علامہ ابنِ نجار رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

"لوگ اس کے جھوٹ اور ضعف پر متفق اللسان تھے۔"

(لسان المیزان صـ۲۹۵ ج ۴)

علامہ ابنِ امیر الحاج مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں:

"لوگوں نے جو بدعتیں نکالیں، جن کو وہ بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور جن کے کرنے کو شعائرِ اسلامیہ کا اظہار کہتے ہیں، ایک مجلس میلاد ہے، جس کو وہ

ربیع الاوّل میں کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہے۔" (مدخل ص۸۵ ج ۱)

علامہ عبدالرحمٰن المغربی اپنے فتاویٰ میں اور علامہ احمد بن محمد مصری مالکی "قول معتمد" میں فرماتے ہیں:

"یہ بدعت ہے۔ نہ نبی علیہ السلام سے ثابت، نہ صحابہ رضؓ سے نہ ائمہ مجتہدین سے ـــ چاروں فقہی مسلک کے علماء اس پر متفق ہیں۔"

خادمِ رسول سیدنا انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"حضرات صحابہ کرام رضؓ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے بڑھ کر اور کوئی محبوب نہ تھا لیکن وہ جب آپؐ کو دیکھتے تو قیام نہ کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ اس عملِ قیام کو پسند نہیں فرماتے۔" (ترمذی ص۱۰۱ ج ۲۔ مسند احمد ص۱۱۱ ج ۳)

گویا حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان جیسے حضرات جو ذاتِ نبوّت کے معاملہ میں حد درجہ حساس تھے، آپؐ کے وضو کا پانی تک زمین پر نہ گرنے دیتے۔ ان کے عمل کا یہ حال ہے اور یہاں گلی گلی کوچہ کوچہ محفلِ میلاد اور اس میں قیام ایک ایسی رسم بن کر رہ گئی کہ ایک دو نسل کے بعد جو طبقہ آئے گا وہ اسی کو دین سمجھ کر بیٹھ جائے گا۔ فیاحسرتا۔

اور اس پر بس نہیں ـــ اس سے آگے جلوس، اس میں مرد و زن کا اختلاط، نمازوں کا ضیاع، معاشی نقصان، نمائشی محرابوں، جھنڈیوں اور چراغاں کے ذریعہ شدید قسم کا اسراف، ایسی باتیں نہیں جن کا نام نہاد علماء، پیرانِ عظام اور حکومتی اداروں کو علم نہ ہو۔ ان منکرات و خرافات کے خلاف جو جذبۂ خیر خواہی کے تحت آواز اُٹھائے، اس کے خلاف جو زبانِ طعن دراز ہوتی ہے وہ سب کو معلوم ہے؛ لفظ وّہابیت" ہمارے ہاں کی وہ گالی اور وہ طعن ہے کہ الامان ـــ اور اس کا پس منظر یہ ہے کہ فلاں شخص نبیؐ کے نام سے چڑتا اور انؐ کا ذکر نہیں سُن سکتا ـــ گویا جو شخص مقصدِ بعثتِ محمدیؐ کی طرف توجّہ دلاتا ہے، آپؐ کی سیرت و اسوہ پر عمل کی بات کرتا ہے، اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ" اور "لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" کے قرآنی حقائق کے حوالہ سے آپؐ کی اطاعت و تابعداری پر زور دیتا ہے، وہ گردن زدنی لیکن جو نماز کا خیال

نہیں کرتا، سودی کاروبار کرتا ہے، سمگلنگ، سٹہ، چور بازاری، رشوت خوری اور اقربا پروری کا رسیا ہے لیکن بس ان رسوم و رواج کا عادی ہے — خوفِ خدا سے عاری بندگانِ شکم کی شکم پری کا اہتمام کرتا ہے اور بدعات و خرافات کی گرم بازاری میں سرگرمِ عمل ہوتا ہے، وہ بہت اچھا، مسلمان اور سنّی —

جنوں کا نام خرد ، خرد کا جنوں رکھ دیا
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

لوگوں کو احساس نہیں کہ حضور علیہ السّلام نے چھ قسم کے افراد پر لعنت بھیجی ہے جن میں ایک ہے، والتارک لسنتی (میری سنّت کو ترک کرنے والا)

اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے حجۃ الوداع میں فرمایا تھا:

"میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑ دی ہیں، اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑا تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ ان میں سے ایک کتاب اللہ اور دوسری سنّت رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہے۔"

(مستدرک ص۹۳ ج ا۔ روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ)

انسان کی نجات "اتباع و اطاعتِ رسول میں ہے نہ کہ خود ساختہ طریقِ محبت میں۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَعَلَى الْمُؤْمِنِ اِتِّبَاعُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ

مومن پر سنّت و جماعت کا اتباع لازم ہے۔ (غنیۃ الطالبین ص۱۹۵

وجہ ظاہر ہے کہ:

دھوکہ کی محبت سے عداوت بہتر — بگڑی ہوئی عقل سے حماقت بہتر

محبت وہی صحیح ہے جس میں" اطاعت و اتباع" ہو ورنہ محض دھوکہ اور فریب ہے۔ اور اس کا انجام بہت عبرتناک — اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن و سنّت کے چشمہ ہائے صافی سے اسلاف کی تعبیرات کے مطابق ہدایت و رہنمائی کی توفیق بخشے اور عملِ صالح کی توفیق ارزانی ہو

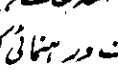

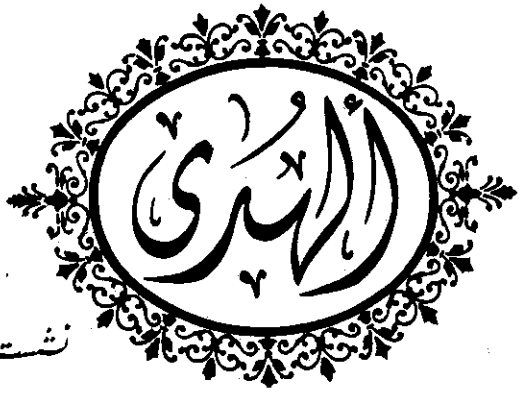

نشست ۲۶

اثباتِ آخرت

سُورہ قیامہ کی روشنی میں

(درسِ ہشتم)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۳)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝

"نہیں! قسم کھاتا ہوں میں قیامت کے دن کی — نہیں! قسم کھاتا ہوں میں نفسِ ملامت گر کی۔"

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ ان دو قسموں میں اللہ تعالیٰ نے اس تمام استدلال کو سمو دیا ہے جو اثباتِ آخرت کے ضمن میں طویل مکی سورتوں میں پھیلا ہوا ہے۔

چنانچہ پہلی قسم ہے خود قیامت کے دن کی — گویا اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ تمہارے ذہنوں میں شبہات ہیں، اشکالات ہیں — تمہارے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ آفرینش سے لیکر الساعۃ یعنی قیامت تک پیدا ہو کر مرنے والے تمام انسان کیسے دوبارہ زندہ اٹھائے جائینگے! ان سب انسانوں کے اعمال کہاں محفوظ ہوں گے! یہ جزا و سزا کا معاملہ کیسے ظہور پذیر ہو سکے گا! لیکن یہ وقوعِ قیامت اس قدر یقینی، قطعی اور حتمی ہے کہ میں اس کی قسم کھا رہا ہوں — یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس میں دلیل کون سی ہے! اگر کوئی شخص اپنا کوئی دعوےٰ پیش کر رہا ہو اور اس سے اس کے دعوے کیلئے کوئی دلیل طلب کی جائے تو جواب میں وہ اس پر صرف قسم کھالے تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اس نے کوئی دلیل پیش نہیں کی — لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس اصول میں بھی ایک دلیل مضمر ہے — اور اصل میں وہ دلیل ہوتی ہے متکلم کی شخصیت کی — اگر کوئی صاحبِ کردار انسان جس پر اعتماد کیا جاتا ہے جس کی صداقت کی گواہی دی جاتی ہے — جب وہ کوئی بات کہتا ہے اور قسم کھا کر کہتا ہے تو اس کے قسم کھانے سے اس بات میں ناقابلِ تردید وزن پیدا ہو جاتا ہے — درحقیقت یہ وزن اصلاً اس شخص کی اپنی شخصیت کا ہوتا ہے — اب یہاں غور کیجئے کہ قسم کھانے والا کون ہے! ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتے ہیں، قسم کھانے والا خود اللہ ہے — اس کلام کا متکلم اللہ ہے — اس نے قسم کھالی ہے — اس کا یہ اثر ماننے والے پر، صاحبِ ایمان پر پڑے گا کہ اس کا دل لرز کر رہ جائے گا — وہ کانپ اٹھے گا کہ قیامت کا دن اتنا یقینی، قطعی اور حتمی درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ سبحانہٗ نے اس دن کی قسم کھائی ہے — لیکن جو لوگ قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے وہ بہرحال اس قسم کو منسوب کریں گے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب — یہاں بھی وہ تاثیر ختم نہیں ہوگی — اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیتِ مبارکہ و مطہرہ کا وزن اس کی پشت پر پھر بھی موجود ہے — یہ قسم کون کھا رہا ہے! جس کی صداقت و امانت کی گواہی اس کے دشمنوں تک نے دی ہے جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل سے یہ پوچھا گیا کہ "کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ

محمد جھوٹ بولتے ہیں" صلی اللہ علیہ وسلم - تو اس نے کہا "ہرگز نہیں، انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا" — پھر جب پوچھنے والے نے پوچھا کہ "پھر تم اُن کی تصدیق کیوں نہیں کرتے! اُن پر ایمان کیوں نہیں لاتے!" تو اُس نے بڑی صفائی کے ساتھ اقرار کیا کہ "اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنو ہاشم کے مابین ایک مسابقت کا مقابلہ جاری ہے - انہوں نے لوگوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھکر کھلائے، انہوں نے مہمان نوازیاں کیں، ہم نے ان سے بڑھ کر کیں - ہم انکے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملائے چلے آرہے ہیں - اب اگر ہم ان کے ایک فرد کی نبوت کو تسلیم کرلیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ہمیشہ ہمیش کے لئے ان کے حلقہ بگوش ہوجائیں گے اور یہ مجھے گوارا نہیں" معلوم ہوا کہ ابوجہل بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ کا الزام نہیں لگا سکا -

یہ بات جو میں نے عرض کی ہے اس کی اہمیت کو اس بات سے بھی سمجھئے کہ جب حضورؐ کو حکم ہوا ہے: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ - "اب آپؐ برملا اوڈنکے کی چوٹ کہیئے وہ بات جس کا آپؐ کو حکم ملا ہے" - تو آپؐ کوہِ صفا پر کھڑے ہوئے، جیسے اُس زمانے میں رواج تھا کہ اگر کوئی اہم خبر لوگوں کو پہنچانی ہوتی تھی تو خبر پہنچانے والا کوہِ صفا پر مادرزاد عریاں ہوکر کھڑا ہوتا تھا اور نعرہ لگاتا تھا "واصباحاہ" "ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے" لوگ اس کی آواز سن کر اور جن تک آواز نہیں پہنچتی تھی تو وہ دور سے دیکھ کر کہ ایک نذیر عریاں کھڑا ہے - اس کے گرد جمع ہوجاتے تھے — حضورؐ نے صرف یہ ترمیم فرمائی کہ آپؐ نے کپڑے نہیں اتارے - یہ بات کسی طرح بھی آپؐ کے شایانِ شان نہ تھی - آپؐ کی حیاء کا عالم تو یہ تھا کہ بالکل بچپن میں کعبہ کی تعمیرِ نو کے لئے جب بچے اپنا تہبند اتار کر اور اس کی گدی بنا کر سر پر رکھ لیتے تھے اور پھر سر پر پتھر رکھکر ڈھوتے تھے تو آپؐ نے بھی مشقت کو ہلکا کرنے کی غرض سے ساتھیوں کے اصرار پر تہبند اتارنے کا ارادہ کیا تو بے ہوش ہوکر گر پڑے - آپؐ نے بھی دستور و رواج کے مطابق نعرہ لگایا "وَاصَبَاحَاہُ" لوگ جمع ہوگئے - اُس وقت آپؐ نے اپنی دعوت پیش کرنے سے پہلے لوگوں سے سوال

کیا "لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا!" لوگوں نے بیک زبان تسلیم کیا "الصادق اور الامین ۔ آپ سچے بھی ہیں امانت دار بھی ہیں"۔ تو جو نہ ماننے والے تھے ان کے نزدیک بھی اس کلام کے متکلم کم از کم محمد ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اور حضورؐ کی شخصیت کا پورا زور اور وزن اس قسم کی پشت پر موجود ہے : لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ہ "کیوں نہیں مجھے قسم ہے قیامت کے دن کی"۔ میں اس کے وقوع کو اتنا یقینی، قطعی اور حتمی مانتا ہوں کہ اس کی قسم کھا رہا ہوں ۔

چنانچہ سورہ تغابن کے درس میں بھی آپ نے دیکھا کہ یہی انداز تھا : قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ۔ "اے نبی! ان سے کہہ دیجئے کیوں نہیں مجھے میرے رب کی قسم ہے تم لازماً دوبارہ اٹھائے جاؤ گے"۔ اس کو اصطلاح میں دلیل خطابی کہتے ہیں ۔ یہ دلیل ایقانی ہے، جس میں اصل دلیل متکلم کے اپنے یقین کو حاصل ہوتی ہے ۔ دلیل کی حیثیت متکلم کی اپنی شخصیت ہوتی ہے ۔ اس کا یقین مخاطبین تک منتقل ہوتا ہے، ان میں سرایت کرتا ہے ۔ تو یہ پہلی دلیل، دلیل خطابی یا دلیل ایقانی ہے ۔ لا اقسم بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۔

اب آیئے دوسری دلیل کی طرف ۔ ارشاد فرمایا گیا : وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ہ "اور کیوں نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی"۔ انسان کے اپنے باطن میں ایک حقیقت ہے جسے وہ ضمیر سے تعبیر کرتا ہے ۔ انگریزی میں جسے Conscience کہا جاتا ہے، اخلاقی تمیز سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ جس کے بارے میں ایک آفاقی و عالمی حقیقت کے طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسان جب کوئی برا کام کرتا ہے تو اسے اندر سے اس کا یہ ضمیر، اس کا یہ Conscience نفس لوامہ ملامت کرتا ہے کہ تم نے اچھا نہیں کیا ۔ یہ تم نے برا کام کیا ہے ۔ برے سے برا انسان بھی یہ جانتا ہے کہ برائی برائی ہے، بدی بدی ہے ۔ اگرچہ مختلف اسباب اور مختلف محرکات کے تحت وہ اس برائی کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے لیکن عین اسوقت بھی وہ یہ جانتا ہے کہ یہ کام برا ہے ۔ اس کو یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ میرا ضمیر مجھے کچوک رہا ہے ۔ جیسے انگریزی میں کہا جاتا ہے : "My conscience is biting me"

یہ چیز درحقیقت وقوعِ قیامت پر سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ قطعی دلیل ہے - یعنی یہ بات کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے نیکی اور بدی کو پہچانتا ہے - ان میں تمیز رکھتا ہے - یہ پہچان فطرتِ انسانی میں ودیعت کی گئی ہے - چنانچہ آخری پارے کی سورۃ الشمس میں یہ الفاظ آئے: وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا "اور گواہ ہے وہ نفسِ انسانی اور جو اُسے بنایا اور سنوارا پھر اس میں فجور اور تقویٰ کا علم الہامی طور پر ودیعت کر دیا۔" ہر انسان جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا بُرائی ہے اور سچ بولنا اچھائی ہے وعدہ کر کے پورا کرنا بھلائی ہے، وعدہ خلافی بُرائی ہے - کسی کو دھوکہ دینا یہ شر ہے کسی کی صحیح رہنمائی کرنا یہ خیر ہے - ظلم، تعدی، ستم یا استحصال یہ بدی کے کام ہیں، عدل و انصاف اور ہمدردی - خدمتِ خلق یہ نیکی کے کام ہیں - ان باتوں میں کہیں بھی انسانوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے -

اگر یہ کوئی حقیقت ہے اور اسکے حقیقت ہونے پر گواہ ہے ہمارا نفس لوّامہ - ہمارا اپنا ضمیر، ہمارا اپنا نفس ملامت گر، ہمارا اپنا Conscience اس پر سب سے بڑی دلیل اپنا ذاتی احساس ہے کہ اگر کسی نہ کسی سبب سے ہم سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے تو خود ہمارا اپنا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے کہ تم نے یہ بُرا کام کیا ہے! - اگر یہ واقعہ ہے اور یقیناً ہے — اُن لوگوں کا معاملہ چھوڑ دیجیے جن کی فطرت مسخ ہو چکی ہو، جن کے دل پتھر بن گئے ہوں، جن کا ضمیر مردہ ہو چکا ہو — تو اگر ہم اس پر غور کریں تو ایک حقیقت واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اس دنیا کی زندگی میں نیکی کا بدلہ بھلائی کی صورت میں اوّل تو ضروری نہیں کہ ملے - اکثر و بیشتر بالکل نہیں ملتا - اگر ملے بھی تو نیکی کی مناسبت سے نہیں ملتا - اسی طرح بدی کی سزا اکثر و بیشتر تو بالکل ملتی ہی نہیں، اگر ملتی بھی ہے تو جرم کے تناسب کے ساتھ نہیں ملتی - مثلاً ہٹلر کا نام ذہن میں لائیے جس کی ہوسِ اقتدار اور جوعِ ارض کی وجہ سے لاکھوں انسان مارے گئے، ہزاروں اپاہج ہو گئے، لاکھوں خواتین بیوہ ہوئیں، کروڑوں بچے یتیم ہو گئے لاکھوں گھر تباہ و برباد ہو گئے اور ان کے مکین بے خانماں ہو گئے - نوعِ انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اندازہ

لگانا مشکل ہوجاتا ہے کہ کتنا بڑا جانی اور مالی نقصان نوعِ بشر کو مجموعی طور پر ہٹلر کی ہوس ملک گیری اور اعلیٰ نسل سے ہونے کے زعم باطل کے باعث پہنچا ہے۔ اب اگر ہٹلر گرفتار ہوجاتا اور اس کے جسم کا ایک ایک ریزہ بھی علٰحدہ کر دیا جاتا تو کیا اُسے اپنے جرم کی پوری سزا مل جاتی! ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک گولی سے اپنی جان ختم کی اور وہ اس سزا سے بھی بچ گیا۔ معلوم ہوا کہ اس اعتبار سے یہ دنیا ناقص ہے یہاں Physical Laws یعنی قوانین طبعیہ تو پورے طور پر بروئے کار آتے ہیں۔ آپ اگر آگ میں انگلی ڈالتے ہیں وہ جل جاتی ہے۔ آپ زہر کھائیں گے تو مر جائیں گے۔ لیکن لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو اکثر و بیشتر کچھ گزند نہیں پہنچتا۔ زبان پر چھالا تک نہیں پڑتا۔ لوگ حرام خواریاں کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر رچ بچ جاتی ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں گلچھرے اڑاتے ہیں، عیش کرتے ہیں۔ وہ لوگ بہتر حالت میں رہتے ہیں اور آسودہ رہتے ہیں جن کے کوئی اصول نہیں ہیں، جن کے کوئی Principles نہیں ہیں۔ جو جائز سے اور ناجائز سے، حلال سے اور حرام سے، خیر سے اور شر سے الغرض ہر طرح سے کمانے کے لئے آمادہ ہیں — اس کے برعکس ان کیلئے دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی ملنی بھی بسا اوقات مشکل ہوجاتی ہے جو جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں، حلال اور حرام میں فرق کریں، صحیح اور غلط کا لحاظ رکھیں۔

اب یا تو یہ مانا جائے کہ یہ دنیا نری اندھیر نگری چوپٹ راج ہے یہ تخلیق عبث ہے۔ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے۔ معاذ اللہ ایسا نہیں ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً — "اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بیکار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا"۔ تو دوسرا Alternative صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اگر خیر خیر ہے، شر شر ہے، نیکی نیکی ہے، بدی بدی ہے تو ایک دوسری زندگی ہونی چاہیئے جس میں ان اعمال کے پورے نتائج ظاہر ہوں۔ نیکی کا بھرپور صلہ اور بھرپور بدلہ ملے۔ بدی کی بھرپور سزا، پورا بدلہ ملے۔ وہاں کے قوانین اخلاقی اقدار کے تابع ہوں۔ اخلاقی اقدار Physical Laws یعنی قوانین طبعیہ کے تابع نہ ہوں۔ یہ ہے استدلال قرآن حکیم کا جو وہ متعدد انداز سے، مختلف اسالیب

سے، متعدد مقامات پر کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اجمال کے ساتھ پیش کرتا ہے۔
— جیسے سورہ القلم میں فرمایا جاتا ہے: اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَالَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ۝ "سو چو تو سہی کیا ہم اپنے فرماں برداروں اور باغیوں کو برابر کر دیں گے کیا تم لوگوں کی عقل ماری گئی ہے کہ ایسے حکم لگاتے ہو۔؟" اگر واقعۃً کوئی اور زندگی نہیں ہے! آخرت نہیں ہے! محاسبہ نہیں ہے! جزا و سزا نہیں ہے، تو باغی مزے میں رہے ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ پھر تو عقلی طور پر اُن کی روش زیادہ درست ہے جنہوں نے خیر اور شر کے مابین کوئی امتیاز نہیں کیا، جنہوں نے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود ہماری عقل تقاضا کرتی ہے کہ دوسری زندگی ہونی چاہیئے جس میں انسان کو اپنے اعمال کی بھرپور جزا اور بھرپور سزا مل جائے۔

یہ ہے درحقیقت خلاصہ اُس پورے استدلال کا جس کو یہاں پر قسم کے اسلوب میں پیش کر دیا گیا ہے: لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی"۔ وہ بات ذہن میں رکھیئے جو سورۃ العصر کے سبق کے ضمن میں بھی میں نے عرض کی تھی کہ قسم کا اصل مفاد اور فائدہ ہوتا ہے گواہی کا۔ گویا کہ ایک تو قیامت پر خود قیامت گواہ ہے۔ ع آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ قیامت اس درجے کی حتمی، یقینی اور قطعی چیز ہے کہ گویا قیامت کے وقوع پر خود قیامت گواہ ہے۔ پھر یہ کہ قیامت پر دوسری گواہی مطلوب ہے تو تمہارا اپنا ضمیر، تمہارا اپنا Conscience گواہی دے رہا ہے کہ نیکی نیکی ہے، بدی بدی ہے۔ آخر میں، میں حوالہ دیدوں کہ جدید مغربی فلسفے کا جسے باوا آدم کہا جاتا ہے۔ یعنی کانٹ (KANT) اس نے Moral law اخلاقی قانون کو بڑی اہمیت دی ہے۔ Critique of practical Reason میں اس نے یہ بات ثابت کی ہے کہ وجودِ باری تعالیٰ یا اللہ تعالیٰ کی ہستی کے اثبات پر سب سے بڑی دلیل انسان کے اندر کا اخلاقی قانون ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت شدہ ہے۔ یہ خیر و شر اور نیکی و بدی کی تمیز کہاں

سے آئی! مادّے میں یہ شعور کیسے پیدا ہوگیا! انسان کے سوا حیوانات میں یہ شعور موجود نہیں ہے۔ حیوانات صرف جبلت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ انسان کی امتیازی شان ہے کہ وہ اخلاقی شعور رکھتا ہے اور خیر کی قدر و قیمت کو جانتا ہے۔ بدی کو، شر کو وہ بُرا سمجھتا ہے۔ پھر اس نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر دو دلیلیں سب سے زیادہ قوی ہیں:

The stars having above and the moral law within

—— ایک تو یہ ستاروں بھرا ہمارے اوپر آسمان اللہ کی ایک عظیم نشانی ہے جس کے متعلق ہم پڑھ چکے ہیں۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ اور دوسرے یہ اخلاقی قانون جو فطرتِ انسانی میں مضمر ہے، ودیعت شدہ ہے۔ کانٹ نے اس دوسری بات کو اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات کے لئے بطورِ دلیل استعمال کیا ہے۔ قرآن اُسے لاتا ہے وقوعِ قیامت اور جزا و سزا کے واقع ہونے کی دلیل کے طور پر: لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ۔ آج اسی پر اکتفا کرتے ہیں بقیہ سورت پر گفتگو ان شاء اللہ آئندہ نشست میں ہو گی۔ اس وقت جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کے بارے میں کوئی سوال ہو یا اشکال ہو تو آپ پیش فرما سکتے ہیں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! ایک شخص کو دُنیا میں اس کے اعمال کی سزا مل گئی ہے اور دوسرے شخص کو دُنیا میں بھی اس کے اعمال کی سزا نہیں ملی۔ تو کیا ان دونوں کے ساتھ آخرت میں مختلف سلوک ہوگا؟

جواب: اصل میں منطقی اور اصولی اعتبار سے دنیا کی سزا کا کوئی تعلق آخرت کی سزا سے نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں نے ایک نشست میں عرض کیا تھا کہ دُنیا نہ تو دارالجزا یا دارالسّزا ہے ہی نہیں —— یہ دارالامتحان ہے۔ یہاں انسان کو جن حالات، واقعات، کیفیات سے سابقہ پیش آتا ہے وہ سب امتحانی کیفیات ہیں —— البتہ اہلِ

ایمان کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہ رعایت برتے گا کہ دنیا میں اگر انہیں کچھ تکالیف پہنچی ہیں یا کسی غلط عمل کی ان کو یہاں سزا مل چکی ہے تو ان کو اُن کی خطاؤں کا کفارہ بنا دے گا۔ یہ اہلِ ایمان کے حق میں اللہ کی خصوصی رعایت و عنایت ہے۔ رہا کفار کا معاملہ! تو ہم سورۂ تغابن میں پڑھ آئے ہیں: فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ "دنیا میں بھی انہوں نے اپنے کئے کا مزا چکھا اور ابھی ایک دردناک سزا، ایک عذاب الیم ہے جو ان کو مل کر رہے گا"۔ لہٰذا ان کے بارے میں تو جو منطقی اور اصولی بات ہے وہی Apply ہوگی۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا اس دنیا میں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ممکن نہیں ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ اسی دُنیا میں مل جائے؟

جواب: جہاں تک امکان کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی کام بھی بعید نہیں ہے وہ جو چاہے کرے۔ وہ ایک دُنیا اس اصول پر تخلیق فرما سکتا ہے کہ اس میں ہر شخص کو اس کی نیکی یا بدی کا صلہ اور بدلہ اُسی دنیا کی زندگی میں مل جائے۔ لیکن ہماری اس دُنیا کو اللہ تعالیٰ نے جس اصول پر تخلیق فرمایا ہے وہ وہ ہے جو قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے: ایک مثال سورہ ملک سے کی ہے: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ اسی سے علامہ اقبال نے خیال لے کر کہا ہے ؎

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

یہ جو ہماری اس دنیا کی زندگی کا وقفہ ہے، یہ امتحانی وقفہ ہے۔ اس میں ہم جانچے اور پرکھے جا رہے ہیں"، اور اس امتحان کے نتائج قیامت کے دن نکلیں گے: ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۔ وہ ہے ہار جیت کے فیصلے کا اصل دن۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا روزِ قیامت کے بارے میں کوئی سائنسی ثبوت دیا جا سکتا ہے؟

جواب : آپ کے سوال میں سائنسی ثبوت سے آپ کی کیا مراد ہے ! یہ بات واضح نہیں ہے - اگر سائنسی ثبوت سے آپ کی مراد ہے کوئی حسّی ثبوت - حواسِ خمسہ کی گرفت میں آنے والی کوئی چیز جو اس کی گواہی بن سکے، تو اس کا جواب تو نفی اور انکار میں ہے - اس لئے کہ ایمان بالآخرہ بھی دوسرے ایمانیات کی طرح ایمان بالغیب کی ایک شق ہے - اس میں انسان کے حواسِ خمسہ کا عمل دخل نہیں ہو سکتا - البتہ آپ کو علم ہوگا کہ Social Sciences. بھی باقاعدہ Sciences, ہیں - منطق بھی سائنس ہے، فلسفہ بھی سائنس ہے، عمرانیات بھی سائنس ہے - اس پہلو سے ان دو آیات کے مطالعہ سے جو بات سامنے آئی ہے، وہ یقیناً ایک سائنسی ثبوت ہے - چونکہ جب ہم غور کرتے ہیں کہ انسان کی فطرت میں، اس کے باطن میں خیر و شر، نیکی و بدی کا شعور ہے اور اس زندگی میں ان کے نتائج یا تو الٹے نکل رہے ہیں - یا بالکل نہیں نکل رہے - یا اگر نکلتے بھی ہیں تو نیکی یا بدی کے تناسب و نسبت سے نہیں نکلتے - لہٰذا آپ سے آپ ثابت ہوتا ہے کہ ایک دوسری زندگی ہونی چاہیئے، جس میں انسانی زندگی کے اعمال کی جزا یا سزا پورے طور پر ظہور پذیر ہو سکے - چنانچہ میں تو اس کو ایک سائنسی دلیل ہی قرار دوں گا -

حضرات ! آج ہم نے سورہ قیامہ کی پہلی دو آیات پر غور کیا جو دو قسموں پر مشتمل ہیں - جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اثباتِ قیامت کے لئے مثبت دلائل کو بڑی جامعیت اور اختصار کے ساتھ پیش فرما دیا ہے - اب آگے اصلاً مخاطبین اور منکرین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے - خطیبانہ انداز میں، جوش و خروش کے ساتھ - اس پر ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ نشست میں گفتگو ہوگی - وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ

(۴) نشست ۲۷

السلام علیکم ! نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم - اما بعد

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی -

حضرات ! گذشتہ نشست میں پوری سورہ قیامہ کی تلاوت آپ نے سماعت

فرمائی تھی اور اس کا رواں ترجمہ بھی آپ کے سامنے آگیا تھا۔ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ اس سورہ کے موٹے موٹے مضامین اور نکات آپ حضرات کے ذہن میں محفوظ ہوں گے۔ میں تین باتوں کی طرف آج آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

پہلی یہ بات تو عرض کی جا چکی ہے کہ سورہ قیامہ کا اسلوب بالکل ایک خطبہ کے مانند ہے۔ خطیب کے سامنے وہ لوگ ہیں جو قیامت اور آخرت کا انکار کر رہے ہیں۔ اور اسکے ضمن میں انکے کچھ شبہات ہیں، ان کے کچھ اعتراضات ہیں جو انہوں نے وارد کئے ہیں۔ ان کا جواب دینا خطیب کے پیش نظر ہے۔ پہلے یہ جان لیجئے کہ منکرین قیامت اور آخرت کی دلیل کیا تھی۔ ع

قرآن مجید میں بار بار ان کی یہ دلیل پیش ہوئی ہے کہ وہ اس کو محال سمجھتے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ جب سب لوگ مٹی ہو کر مٹی میں مل جائیں گے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر تا قیام قیامت تمام انسان دوبارہ کیسے زندہ کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ کہیں ان کے الفاظ نقل ہوئے۔ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذَٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ ۝ "کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو پھر ہمیں اٹھا لیا جائے گا ع یہ تو بہت دور کی بات معلوم ہوتی ہے"۔ یہ لوٹنا قرین قیاس نظر نہیں آتا۔ کہیں ان کا یہ قول نقل ہوا: ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ قَالُوا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ "جب ہماری ہڈیاں گل سڑ جائیں گی کیا اس کے بعد بھی ہمیں اٹھایا جا سکے گا ع کہتے ہیں کہ یہ دوبارہ اٹھایا جانا تو پھر بڑے گھاٹے کا معاملہ ہوگا!" یہ گویا بعث بعد الموت پر ان کا طنز ہے۔ کہیں ان کا تبصرہ نقل ہوا ہے: هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ ۝ "بڑی دور کی بات ہے، بڑی ان ہونی بات ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے"۔ کہیں ان کے الفاظ ہیں: وَقَالُوا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۝ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم صرف ہڈیاں ہوں گے گلی سڑی تو کیا پھر ہمیں دوبارہ پیدا کر کے اٹھا لیا جائے گا۔ ع۔ ان کے اس استفہامی انداز میں طنز اور انکار مضمر ہے۔ وہ ایسا ہونا امر محال سمجھتے تھے۔

سورہ قیامہ میں دو قسموں کے بعد، جن کے بارے میں، میں عرض کر چکا ہوں کہ اس اسلوب میں تو قرآن مجید کا مثبت استدلال جامعیت کے ساتھ آگیا۔ اب ان کے اعتراضات، ان کے شبہات، ان کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا گیا: اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ ۝ "کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے ہ" اس کے جوابات اس سورہ مبارکہ میں دیئے گئے ہیں، ان کے متعلق جان لیجئے کہ وہ بھی دو نوعیت کے ہیں۔ ایک وہی خطابی انداز کا جواب، اذعانی و ایقانی انداز کا جواب: بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ۝ "کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس کی ایک ایک پور کو برابر کر دیں"۔ —— یہاں، جیسا کہ میں نے پچھلی مرتبہ عرض کیا تھا، اصل وزن متکلم کی شخصیت کا ہے۔ کہنے والا کس یقین سے کہہ رہا ہے۔ کس اذعانی کیفیت کے ساتھ کہہ رہا ہے۔ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ۝ یقیناً ہم کو اس پر کامل قدرت حاصل ہے کہ ہڈیاں تو ہڈیاں ہم انکی ایک ایک پور کو درست کر دیں —— بظاہر تو یہ صرف ایک دلیلِ خطابی ہے۔ لیکن غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک منطقی دلیل بھی مضمر ہے۔ وہ منطقی دلیل یہ ہے کہ مخاطب اس بات پر غور کرے کہ آیا وہ اللہ کو بھی مانتا ہے یا نہیں۔ اگر تو وہ اللہ ہی کو نہیں مانتا تو اس سے قیامت اور بعثِ بعد الموت کے بارے میں گفتگو بیکار سے بے معنی ہے۔ ایسے شخص سے پہلی گفتگو تو وجودِ باری تعالےٰ کے بارے میں ہوگی۔ لیکن اگر وہ اقرار کرے کہ وہ اللہ کو مانتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ اللہ کو عاجز یا لاچار مانتا ہے یا عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ مانتا ہے! اگر اس نے اللہ کو Omini-potent مانا ہے۔ علیٰ کل شیٔ قدیر مانا ہے تو اب اس کا اعتراض خود بخود ہوا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے تو پھر تمہارا اعتراض کس بات پر ہے تمہارے تمام شکوک و شبہات کے غبارے کی ہوا خود نکل گئی۔ اب تمام اعتراضات کے منطقی جواب تک تم خود پہنچ سکتے ہو۔ اگر اللہ کے وجود سے انکار ہے تو پہلے گفتگو ہوگی وجودِ باری تعالےٰ کے بارے میں اس کی صفاتِ کاملہ کے بارے میں —— اگر مانتے ہو اور اُسے

علیٰ کل شیٔ قدیر تسلیم کرتے ہو تو اب تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جو علیٰ کل شیٔ قدیر ہے وہی ہے جو مُردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

دوسری دلیل انسان کے مشاہدات سے دی گئی ہے۔ یہ دلیل اس سورۃ مبارکہ کے آخر میں وارد ہوئی ہے کہ "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جائیگا۔ ذرا غور تو کرو۔ انسان خود اپنی تخلیق پر غور کرے، اپنی اس تخلیق کے اس حصے پر جو اس کے علم میں ہے۔ انسان جانتا ہے کہ اس کا آغاز ایک گندے پانی کی بوند سے ہوا جو ٹپکائی گئی۔ پھر اس بوند نے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کی۔ پھر اسی لوتھڑے کے اندر سے یہ تمام اعضاء و جوارح، یہ سماعت و بصارت، یہ شعور و ادراک، یہ عقل و فہم یہ انسان کی حیرت انگیز اور حیران کن مشینری وجود میں آئی۔ اس کی تخلیق بھی ہوئی اس کا تسوّی بھی ہوا۔ اس کی نوک پلک سنواری گئی۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھکر اُسی ایک بوند سے جس میں بڑی سے بڑی Microscope بھی تاحال کوئی فرق نہیں کر سکے گی کسی کو نر بنا دیا کسی کو مادہ بنا دیا۔ پھر ان کا جسمانی نظام کتنا مختلف ہے نہ صرف جسمانی بلکہ نفسیاتی ساخت میں عورت و مرد کے مابین کتنا مختلف ہے! اللہ تعالےٰ کی یہ ساری خلاقی تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس سب کو دیکھ کر بھی تمہیں اب بھی یہ وسوسہ لاحق ہوتا ہے اور یہ شبہ اور یہ اعتراض تمہارے ذہنوں میں آتا ہے کہ وہ اللہ کیا اس پر قادر نہیں ہوگا کہ وہ مُردوں کو زندہ کر سکے! یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے لئے اس سورہ مبارکہ کی آخری یہ آیات پیشِ نظر رکھیئے:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ۝ اَلَمْ یَکُ نُطْفَۃً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ۝ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۝ فَجَعَلَ مِنْہُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی ۝ اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ۝

یہ ہے استشہادی دلیل۔ انسان کے مشاہدے سے ایک دلیل لاکر ان کے وسوسے اور ان کے اعتراض کا ابطال کیا جا رہا ہے۔ ان کا اعتراض منطقی نہیں ہے۔ ان کا اعتراض فلسفیانہ نہیں ہے۔ فلسفہ کے اعتبار سے تو وہ بھی ماننے پر مجبور ہوں گے کہ نیکی

کا بدلہ بھلا ملنا چاہیئے - ع گندم از گندم بروید جو زِ جو - بدی کی سزا ملنی چاہیئے - دنیا میں نہیں مل رہی تو دوسری زندگی ہونی چاہیئے اس کا عقل تقاضا کرتی ہے فطرت مطالبہ کرتی ہے - ان کو جو اشکال تھا وہ اس کے محال ہونے کے بارے میں تھا - کیسے ہوگا کہ انسان جو مر کر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے - اس کی ہڈیاں بھی گل سڑ جاتی ہیں وہ دوبارہ زندہ اٹھایا جائے - !

اس کا جواب ایک تو اس خطابی انداز میں دے دیا : بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ - جس میں یہ منطقی دلیل بھی مضمر ہے کہ جب تم نے اللہ کو مانا اور اُسے عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ مانا تو اب تمہارے پاس اعتراض کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی دوسرا جواب انسان کی اس تخلیقِ اوّلی سے دیا گیا کہ ذرا اندازہ تو کرو اس ہستی کی خلاقی کا، اسکی قدرت کا - کیا تم اس سے یہ بعید سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا !! ظاہر بات ہے کہ اس کا جواب ہر سلیم الفطرت اور ہر سلیم العقل انسان اثبات میں دے گا - اور یہی بات ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی اور آپؐ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ اس سورت کے اختتام پہ آپؐ فوراً فرمایا کرتے تھے : بَلٰى وَ رَبِّنَا - "اے پروردگار! ہم اس پہ گواہ ہیں کہ تو مردوں کو زندہ کر سکتا ہے"۔

اس سورۂ مبارکہ میں جو دوسرا اہم مضمون آیا وہ یہ کہ اگر ان کا یہ اعتراض باطل ہے تو پھر ان کے انکار کا اصل سبب کیا ہے! یہ آخرت کے منکر کیوں ہیں!! اس کو تسلیم کیوں نہیں کر رہے!!! — اس کا بہت ہی اہم اور بہت بنیادی جواب دیا گیا:

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ.

اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ انسان جب فسق و فجور کا عادی ہو جاتا ہے - حرام خوری کی جب اُسے عادت پڑ چکی ہوتی ہے - حرام کی کمائی سے حاصل ہونے والے عیش کا جب وہ خوگر ہو جاتا ہے - لذّات کوشی جب اس کی گھٹی میں رچ بس جاتی ہے - تو اب ان سب کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا - اگر آخرت کو مانے تو اُسے

حلال وحرام میں تمیز کرنی پڑے گی - جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ وہ جو کہاوت ہے کہ کبوتر جب بلّی کو دیکھتا ہے تو وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے حالانکہ کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلّی معدوم نہیں ہو جاتی - لیکن یہ کہ کبوتر اس خطرے کی تاب نہیں لا سکتا لہذا اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے - بالکل یہی نفسیاتی کیفیت ہے ان منکرین آخرت کی کہ یہ جس فسق و فجور کے عادی ہو چکے ہیں - جس کو چھوڑنے کے لئے یہ تیار نہیں ہیں، اس کو جاری رکھنے کے لئے یہ آخرت ہی کا انکار کر رہے ہیں - اسی میں انہوں نے اپنے لئے عافیت سمجھی ہے کہ آخرت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں -

ایک دوسرا سبب یہ ارشاد فرمایا گیا جو اسی تصویر کا دوسرا رُخ ہے -

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝

اصل سبب تمہاری گمراہی کا یہ بھی ہے کہ تم عاجلہ سے محبت کرتے ہو - تم اس کے پرستار بن گئے ہو - لفظ عاجلہ عجلت سے بنا ہے مراد اس سے دُنیا ہے - اس لئے کہ اس کا نفع بھی نقد ہے، نقصان بھی نقد ہے - اس کی لذتیں بھی محسوس ہیں اور اس کی کلفتیں بھی فوری اثر کرنے والی ہوتی ہیں - یہ دنیا کی زندگی عاجلہ ہے - تم اس عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہو اور آخرت کی زندگی کو نظر انداز کرتے ہو - اُسے فراموش کر دیتے ہیں — اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ کوتاہ بین ہوتے ہیں - جو فوری لذتوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے - فوری آسائشوں کو قربان نہیں کر سکتے، وہ آگے نہیں بڑھ سکتے - جنہیں آگے بڑھنا ہوتا ہے، جو دور اندیش ہیں - جن کی نگاہ دُور بین ہے وہ راحت و آرام کو تج کر محنت کرتے ہیں - راتوں کو جاگتے ہیں تاکہ اپنے دنیوی مستقبل کو اپنے Career کو روشن کر سکیں - تو جو لوگ اس کا خیال نہیں رکھتے، وہ دُنیا میں بھی پیچھے رہ جاتے ہیں - اسی طرح جو لوگ دنیا کی فوری لذت اور عیش اور راحت کو تج دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے - جو اس عاجلہ کی محبت میں اس کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں - اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آخرت کو نظر انداز کرتے ہیں - اُس انجام سے غافل ہو جاتے ہیں جس سے بہر حال ہر ذی نفس کو حیات اُخروی میں سابقہ پیش آ کر رہے گا - اسی رویّہ کو اچھے انداز سے اس شعر میں پیش کیا گیا ہے -

اب تو آرام سے گزرتی ہے
آخرت کی خبر خدا جانے

اس شعر میں اُسی نفسیاتی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔

اس سورۂ مبارکہ میں انکارِ قیامت کا جو تیسرا سبب بتایا گیا ہے وہ تکبّر ہے:
فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۝ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی ۝ "پس اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز ادا کی۔ بلکہ جھٹلایا اور روگردانی کی۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا"۔ اگر انسان تصدیق کرے تو گویا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مان لی۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ تابعین کرامؒ میں سے جن حضرات کو تفسیرِ قرآن سے خصوصی شغف تھا وہ کہتے ہیں کہ یہاں اگرچہ الفاظ عام ہیں اور ان میں ایک عام متکبر انسان کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ لیکن یہاں معین طور پر ابوجہل مراد ہے اور میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس کے اعتراض کا، تکذیب کا، انکار کا سب سے بڑا سبب تکبّر تھا۔ وہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نیچا ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ فَلَا صَدَّقَ۔ اب اگر وہ نبی اکرمؐ کی تصدیق کرتا ہے جو خبر دے رہے ہیں وقوعِ قیامت کی۔ تو وقوعِ قیامت کی تصدیق کرنے کے معنی نبیؐ کے سامنے جھکنے کے ہیں۔ اس کے لئے اسکی متکبرانہ طبیعت آمادہ نہیں۔ نماز پڑھے گا تو اللہ کے سامنے جھکنا ہوتا ہے۔ اسکی اکڑی ہوئی گردن اپنے خالق کے سامنے جھکنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس طرح توحید کو تسلیم کرنا ہوگا اور توحید پر ایمان کی دعوت لے کر آئے ہیں۔ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بنو ہاشم کے فرد ہیں۔ وہ قبائلی عصبیت اور اپنے ذاتی پندار کے باعث اس لئے تیار نہیں کہ بنو ہاشم کے فرد کی نبوت و رسالت کی تصدیق کرے۔ لہٰذا اس کی گمراہی کا سب سے بڑا سبب ہی تکبّر بن گیا۔

ایسی مختصر سی کسی نشست میں تسلسل کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ کے تمام مضامین کا مطالعہ اور احاطہ ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میں سورہ مبارکہ کے مطالب، معانی اور مفاہیم کا تجزیہ بیان کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ اب اس سورہ مبارکہ کے مضامین کے تیسرے

حصے کے متعلق میں اختصار سے اہم باتیں عرض کئے دیتا ہوں -

تین مختلف مواقع کی ایسی تصویر حال کی گئی ہے کہ نگاہوں کے سامنے پورا نقشہ آجاتا ہے - ایک نقشہ ہے الساعۃ کا - وہ بڑی ہلچل جو اس کائنات کے نظام میں آنے والی ہے، جس کے بارے میں سورۂ حج میں فرمایا: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ - "لوگو اپنے پروردگار کا تقویٰ اختیار کرو، اسکی نافرمانی سے بچو، حقیقت یہ ہے الساعۃ کا زلزلہ بڑا خوفناک ہوگا - بہت بڑا حادثہ ہوگا" یہ قیامت کی آمد کا پہلا نقشہ ہے جسے قرآن مجید یہاں الساعۃ سے موسوم کرتا ہے - اسی کو القارعہ، الحاقہ، الطاغیہ اور الطامۃ الکبریٰ بھی فرمایا گیا ہے - اسی الساعۃ کا نقشہ اس سورہ مبارکہ میں یوں کھینچا گیا: فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۝ — "جب نگاہ چندھیا جائے گی - چاند بے نور ہو جائے گا - سورج اور چاند یک جا کر دیئے جائیں گے" - معلوم ہوتا ہے کہ گردش ثقل کا جو باہمی نظام ہے، اس کا معاملہ درہم برہم ہو جائے گا - اور یہ بڑے بڑے کرّے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں گے اور چاند سورج میں دھنس جائے گا تو یہ اس الساعۃ کے ابتدائی احوال ہیں جب یہ کیفیت نظر آئے گی تو یہی انسان جو اس وقت اکڑ رہا ہے، بڑے متکبرانہ انداز میں Challange کر رہا ہے کہ کب ہوگا قیامت کا دن! یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ۝ — اُس روز اس کی گھگھی بنی ہوئی ہوگی اور "اُس روز یہی انسان کہہ رہا ہوگا - ہے کوئی پناہ گاہ! ہے کوئی جائے فرار!" - كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ یَوْمَئِذِ ۨ الْمُسْتَقَرُّ ۝ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ ۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝ "ہرگز نہیں! اس روز کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی - اس روز اے نبی، تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہوگا - اُس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا جتلا دیا جائے گا" ایک نقشہ تو یہ کھینچا گیا -

دوسرا نقشہ ہے - یَوْمُ الْقِیٰمَةِ کا - جس روز لوگ اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہوں گے - نتیجے کا اعلان ہونے والا ہوگا - جیسے کہ آپ اسکولوں میں

دیکھا ہوگا کہ جس روز سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلتا ہے تو طالبعلم جب کھڑے ہوتے ہیں تو نتیجہ انکے اپنے چہروں پر لکھا ہوتا ہے جو پاس ہونے والے ہیں، جن کو معلوم ہے کہ ہم کیا کرکے آئے ہیں۔ ان کے چہرے تر و تازہ ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ اور جنہیں معلوم ہے کہ ہم فیل ہونے والے ہیں جیسا کہ اسی سورہ مبارکہ کی آیات نمبر ۱۴ ۱۵ میں فرمایا: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۙ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ۝ ہر انسان کو خوب معلوم ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے، وہ کہاں کھڑا ہے، اور چاہے وہ کتنے ہی بہانے تراشے، معذرتیں پیش کرے لیکن وہ اپنی تمام باطنی کیفیات، اپنے اصل محرکاتِ عمل کو اچھی طرح جانتا ہے۔ لہٰذا بارگاہ رب العزت میں جب وہ کھڑے ہونگے تو ان کے چہروں پر ان کا انجام، ان کے امتحان کا نتیجہ لکھا ہوگا: وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ "اس روز بہت سے چہرے ہونگے تر و تازہ اور شاداں"۔ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ "اپنے پروردگار کی رحمت کے اُمیدوار۔ اپنے پروردگار کی رحمت کا انتظار کرتے ہوئے"۔ اور اُس روز کچھ چہرے ہوں گے: وَجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ بَّاسِرَةٌ ۝ "سوکھے ہوئے، اداس، پریشان و افسردہ"۔ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝ "ان کے چہروں پر یہ خوف طاری ہوگا کہ اب ہمارے ساتھ کمر کو توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے۔"

تیسرا نقشہ جو کھینچا گیا ہے، وہ ہے قیامتِ صُغریٰ کا نقشہ عالمِ نزاع کا نقشہ موت کا۔ موت کے وقت کا نقشہ۔ انسان کی موت درحقیقت قیامتِ صغریٰ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُهٗ۔ "جو مر گیا اس کی قیامت تو واقع ہو گئی"۔ مہلتِ عمل ختم ہوئی۔ جیسے کہ امتحان گاہ میں کہا جاتا ہے کہ وقت ختم ہو گیا لکھنا بند کر دیا جائے، قلم رکھ دیئے جائیں۔ تو یہ موت درحقیقت اس مہلتِ عمل کے خاتمے کا نام ہے۔ اس وقت کا نقشہ کھینچا گیا: كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ۝ وَقِیْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝ "جس دن کہ جان ہنسلیوں میں آن پھنسے گی اور کہا جائے گا ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا!"۔ ساری تدبیریں ناکام ہو چکیں، معالج جواب دے چکے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس موقع پر بڑے سے بڑا Rationalist اور بڑے سے بڑا پٹھے خاں بھی اس تگ و دو میں لگ

جاتا ہے کہ کوئی ٹوٹا کوئی ٹوٹکا کام کر جائے، کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہی آ کر جان بچالے۔ لیکن اس وقت صورتِ واقعہ یہ ہوگی کہ یقین ہو جائے گا کہ اب جدائی کا وقت آن پہنچا ہے: وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ "اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹی ہوگی" وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ یہ موت کے وقت کی مختلف حالتوں میں سے ایک حالت کے لئے استعارہ ہے۔ اس روز کہہ دیا جائے گا کہ: اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ ۝ "آج تو اپنے رب کی طرف ہی جانا ہے، چار و ناچار، کشاں کشاں"۔

یہ تین نقشے ہیں۔ ان نقشوں کو پیش کرنے سے جو مطلوب و مقصود ہے جو اس کا حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کے منکر ہیں جو کبوتر کے مانند اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ جو اپنی فطرت کی گواہی پر غور نہیں کر رہے۔ اپنے ضمیر کی پکار کو نہیں سن رہے۔ اُس کی خلش پر دھیان نہیں دے رہے۔ اس کی ملامت کی پرواہ نہیں کر رہے۔ جو عقل و شعور سے کام نہیں لے رہے اور جو ان واقعات سے جن کا ہونا حتمی و یقینی ہے۔ جیسا سورہ ذاریات میں فرمایا گیا: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝ "بلاشبہ تم سے جو وعدہ کیا جا رہا ہے، وہ سچا ہے، حق ہے اور یقیناً جزا و سزا کا دن واقع ہو کر رہے گا"۔ ان سے اپنی نگاہوں کو بالکل دُور رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے لئے افسوس ہے، ہلاکت ہے، بربادی ہے:

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝

اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام بد سے بچائے اور ہمارے دلوں میں وقوعِ قیامت اور آخرت کا یقین پیدا بھی فرما دے اور اُسے اپنی رحمتِ کاملہ سے راسخ اور پختہ بھی فرمائے۔ اب آج کے اس بیان کے ضمن میں کوئی سوال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! ایک صحیح العقل انسان اور ایک فاتر العقل انسان کے محاسبے میں کوئی فرق ہوگا یا دونوں کا ایک جیسا محاسبہ ہوگا۔؟

جواب: نہیں یہ تو بالکل خلافِ عقل بات ہوگی کہ ان کا محاسبہ ایک ہی سطح پر ہو۔ مجنون اور فاتر العقل انسان کے بارے میں جان لیجئے کہ دینی اصطلاح وہ مرفوع

القلم ہے - اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے - وہ حساب کتاب سے بری ہے -

سوال : ڈاکٹر صاحب : ایک شخص ساری زندگی برائی کرتا ہے اور عیش و عشرت میں پڑا رہتا ہے - لیکن جب وہ بستر مرگ پر پڑا ہوتا ہے - اس وقت وہ توبہ استغفار کرتا ہے تو کیا اس کی توبہ قبول ہوگی - ؟

جواب : یہ بہت صحیح سوال ہے - اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں ہوتی، جس پر موت کے آثار شروع ہو چکے ہوں - سورہ نساء میں اس کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ لَیَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَالَمْ یُغَرْغِرْ - "بے شک اللہ جو بڑی عزت و جلالت کی شان کا حامل ہے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک نزع کا گھنگرو اس کے حلق میں بولنے نہ لگے" معلوم ہوا کہ جب تک موت کے آثار شروع نہیں ہوتے اور عالم نزع طاری نہیں ہوتا، اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے - جب موت کا آثار شروع ہو جائیں تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے - اب تو گویا کہ امتحان کی مدت ختم ہو رہی ہے - مہلت عمل تمام ہو رہی ہے -

سوال : ڈاکٹر صاحب! فلسفۂ ارتقاء کے بعض حاملین کے نزدیک روز قیامت دراصل وہ ہوگا - جس دن خالق اور مخلوق آپس میں سما جائیں گے اور اس طرح سے تخلیق آدم کا مقصد پورا پورا ہو جائے گا - اس کیفیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب : اوّل تو میرے علم میں نہیں ہے کہ فلسفۂ ارتقاء کے کن حاملین کا یہ خیال ہے ! بعض صوفیوں سے یہ بات البتہ منسوب ہے کہ ان کے خیال میں یہ کیفیت ہونے والی ہے کہ بالآخر یہ سلسلہ وجود پھر اپنے خالق کے ساتھ متحد ہو جائیگا - جیسے ایک قطرہ سمندر میں شامل ہو جائے لیکن یہ محض ایک خیال ہی ہے - ہمارے دین میں جو باتیں ہمیں واضح طور پر بتائی گئی ہیں، ان میں اس خیال کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے - حتمی طور پر دین یہ تعلیم دیتا ہے کہ اس دنیا کے بعد آخرت کا مرحلہ لازماً آنے والا ہے - وہ تو واقع ہو کر رہے گا - اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے - سورہ تغابن کے مطالعہ کے دوران ہم پڑھ چکے ہیں کہ نبی

اکرم سے فرمایا گیا: قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۔ اسی ضمن میں، میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبے کا بھی حوالہ دیا تھا، جس کا آخری حصہ یہ ہے کہ: وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّ بِالسُّوْءِ سُوْءً وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوْ نَارٌ اَبَدًا ۔ "خدا کی قسم تم سب مر جاؤ گے جیسے روزانہ سو جاتے ہو! پھر لازماً اٹھائے جاؤ گے جیسے ہر صبح بیدار ہو جاتے ہو ۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا ۔ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لئے یا آگ ہے دائمی"۔ البتہ اس کے بعد بھی کیا کچھ مراحل ممکن ہیں! ان کو قرآن مجید زیر بحث نہیں لایا۔ جبکہ آخرت کے متعلق واضح نصوص کتاب و سنت میں موجود ہیں ۔ ان کو عقلی دلائل یا قرآن کے محض کسی اشارے کی بنا پر درمیان میں سے نکال دینا صریح طور پر گمراہی ہو گی ۔

حضرات! آج ہم نے سورہ قیامہ پر غور ایک حد تک مکمل کر لیا ہے ۔ البتہ اس سورۂ مبارکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرما کر جو نہایت اہم باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، وہ اس بات کی متقاضی اور مستحق ہیں کہ ہم اس پر ایک پوری نشست مزید لگائیں ۔ ان شاء اللہ آئندہ نشست میں ان آیات پر گفتگو ہو گی ۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

(۵) نشست ۲۸

السلام علیکم! ۔ نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ۔ اما بعد
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ ٥ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ ٥
فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ٥ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ ٥
صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

"تو اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اس قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی

سے حرکت مت دیجئے کہ اسے جلدی سے حاصل کرلیں - ہمارے ذمہ ہے
اسے جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا ـ تو پھر جب ہم پڑھوائیں تو آپ اسی
کے پڑھنے کی پیروی کیجئے - پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی مزید تشریح
اور توضیح بھی "۔

محترم حاضرین و معزز ناظرین -

یہ سورہ قیامہ کی چار آیات ہیں، آیات نمبر ۱۶ تا ۱۹ - اگرچہ بحیثیت مجموعی سورہ قیامہ پر ہم اپنی گفتگو مکمل کر چکے ہیں اور اس کا جو اصل مضمون ہے یعنی اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے ضمن میں منکرینِ قیامت کے اعتراضات و شبہات کا جواب تو وہ بحث مکمل ہو چکی ہے لیکن اس سورۃ مبارکہ میں ایک اہم مضمون ضمناً آیا ہے آج ہم اس پر غور کریں گے -

یہ بات تو ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن مجید کا اسلوب چونکہ خطبہ کا ہے اور خطبہ میں تحویلِ خطاب ہوتا ہے کہ ابھی خطیب کسی ایک جانب مخاطب ہے - پھر اس کا خطاب دوسری جانب ہو گیا - کبھی وہ حاضر کو غائب فرض کر کے گفتگو شروع کر دیتا ہے - کبھی غائب کو حاضر فرض کر کے گفتگو شروع کرتا ہے - تو سورہ قیامہ میں ساری گفتگو تو منکرینِ قیامت کے ساتھ ہے - لیکن درمیان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرما کر بہت ہی اہم امور ہیں، جنہیں بیان فرما دیا گیا -

سب سے پہلے تو یہ سمجھئے کہ اس سورہ مبارکہ کا جو اصل مضمون ہے، اس کے ساتھ اس گفتگو کا ربط و تعلق کیا ہے یا اس لئے کہ چاہے کوئی بات ضمناً آئی ہو لیکن ظاہر بات ہے، کہ اس سورہ مبارکہ کا جو عمود ہے، جو مرکزی مضمون ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی ربط و تعلق ہونا ضروری ہے ـــ آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ مبارکہ میں لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب بیان فرمایا گیا حُبِّ عاجلہ : كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۙ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ؕ "تمہاری اصل گمراہی یہ ہے"۔ یا یوں کہیے کہ تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہو"ـــ اور عاجلہ سے مراد ہے یہ دنیا - جس کی لذتیں بھی فوراً محسوس ہوتی ہیں اور اس کی کلفتیں اور اذیتیں بھی فوری طور پر انسان محسوس کرتا ہے، جس کا نفع بھی نقد ہے اور نقصان بھی نقد ہے - جب یہ عاجلہ یہ جلدی والی چیز انسان کا اصل مطلوب اور مقصود بن

جاتی ہے تو ظاہر بات ہے کہ جو وسیع ترین حقائق ہیں یا بلند ترین حقائق ہیں ان سے نگاہیں خود بخود محجوب ہو جاتی ہیں ۔ وہ حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور یہ اصل سبب ہے انسان کی گمراہی کا۔

یہاں ایک چھوٹی اور ہلکی لفظی مناسبت سے بات کا رُخ حضورؐ کی طرف موڑ دیا گیا : لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ ۔ اے نبی آپ اپنی زبان مبارک کو تیزی سے حرکت نہ دیں کہ قرآن مجید کو جلدی سے یاد کر لیں ۔ اب رہا یہ معاملہ کہ انسان اس عاجلہ یعنی دنیا کا پرستار بن گیا ہو تو اس کی ہلاکت خیزی، اسکی خطرناکی اور اسکی انسان کے حق میں مہلک ہونے کی کیفیت اظہر من الشمس ہے ۔ یہاں اشارہ کر دیا گیا کہ "جلدی" وہ چیز ہے ۔ جو خیر کے لئے بھی پسندیدہ نہیں ہے ۔ نیکی اور بھلائی میں بھی عجلت پسندی یہ مطلوب شے نہیں ہے ۔ بلکہ خیر میں، نیکی میں اور بھلائی میں بھی تدریج پیش رہنی چاہیئے ۔ سچ پکے سو میٹھا ہو ۔ ہر کام کو مہلت کے ساتھ اور اس پر مناسب توجہ، ہمت اور محنت صرف کر کے اُسے مکمل کیا جائے ۔ تب ہی کام صحیح ہوتا ہے ۔ نتائج صحیح نکلتے ہیں ۔ تو یہ ایک بڑی لطیف معنوی ربط و تعلق کی بات تھی جس کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کا رُخ مڑ گیا ۔

عجلت پسندی کے متعلق یہ جان لیجیئے کہ قرآن حکیم اس کو انسان کی طبعی کمزوریوں میں شمار کرتا ہے چنانچہ سورہ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے : خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۝ جیسے سورہ نساء میں فرمایا گیا : خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝ "انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے" اس کی خلقت میں بعض پہلو ضعف کے ہیں ۔ اسی طرح فرمایا کہ اس کی خلقت میں اس کی سرشت میں کچھ عجلت پسندی کا مادہ موجود ہے ۔ یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں فرمائی : وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ "انسان بہت جلد باز واقع ہوا ہے" اب دیکھیئے کہ اگر اس عجلت پسندی کا رُخ شر کی طرف اور نفس پرستی کی طرف ہو جائے تو اس کی تباہ کاری، اس کی ہولناکی اور اس کی خطرناکی اظہر من الشمس ہے ہی ۔ لیکن اگر اس عجلت پسندی کا رُخ خیر کی جانب ہو، تب بھی یہ چیز غیر مطلوب اور ناپسندیدہ ہے ۔ اسکی بہت نمایاں مثال سورہ طٰہٰ میں آئی ہے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے طلب فرمایا تو آں جنابؑ وقت مقررہ سے قبل پہنچ گئے ۔ اللہ تعالیٰ نے سوال کیا : وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝

"اے موسیٰ! یہ وقتِ مقررہ سے قبل اپنی قوم کو چھوڑ کر کیوں آ گئے ؟" جواباً حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا: قَالَ هُمْ أُولَاءِ عَلَىٰ أَثَرِي ۔ "پروردگار وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں"۔ وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ ہ "اور میرے رب! میں تو جلدی کر کے آیا ہوں تاکہ تو راضی ہو جائے"۔ وہ جو ایک مصرع ہے ع "تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ"۔ اس میں تھوڑا سا تصرف کر لیجئے کہ ع "تو میرا شوق دیکھ میرا اشتیاق دیکھ!" میں تیری ملاقات کے شوق میں جلدی کر کے آگیا ہوں۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کا جواب سُنیے: قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ہ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! اس عجلت کا نتیجہ نکل چکا ہے ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو فتنے میں مبتلا کر دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے"۔ معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہ عجلت مزوری تھی لیکن اللہ سے ملاقات کی جلدی تھی، مخاطبہ الٰہی سے شاد کام ہونے کی جلدی تھی۔ لیکن اس کا بھی ایک نتیجہ برآمد ہوا۔ اسی سورۂ طٰہٰ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے فرمایا گیا: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ہ "اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ کا ذوق اور آپ کا شوق ہمارے علم میں ہے۔ آپ کا شوق اور اشتیاق اپنی جگہ لیکن نزولِ قرآن کیلئے ہم نے ایک ترتیب اور ایک تدریج معین کر دی ہے۔ آپ اس سے قبل اس قرآن کیلئے جلدی نہ کیجئے۔ جو بھی اس کا وقت ہماری حکمتِ بالغہ میں معین ہے، اسی کے مطابق اس کا نزول ہوگا اور آپ دُعا کرتے رہا کیجئے کہ میرے علم میں اور اضافہ فرما"۔ سورہ مریم میں اسی ضمن میں یہ بات بھی آئی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی زبان سے حضورؐ کے شوق و اشتیاق کے سلسلہ میں یہ بات کہلوائی گئی۔ محسوس ہوتا ہے کہ حضورؐ نے حضرت جبرئیلؑ سے شکوہ کیا ہوگا کہ آپ دیر سے آتے وقفہ دے کر آتے ہیں، ہمیں انتظار رہتا ہے تو جواباً کہلوایا گیا: وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۖ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ہ "ہم آپ کے رب کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہو سکتے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا اختیار بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اس کا اختیار بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اس کا اختیار بھی کلیتہً اسی کے اختیار میں

ہے - اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے" یہ تاخیر و تعویق کسی نسیان کے باعث نہیں ہے — اسی سورہ مریم میں حضورؐ سے خطاب کر کے فرمایا گیا: وَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ — اور اے نبی! ان کفار کے حق میں بھی کچھ جلدی نہ کیجئے - کہ ہم ان کا جلدی فیصلہ چکا دیں - یہ ہماری گرفت میں ہیں - کہیں بھاگ کر نہیں جائیں گے - ہر ایک کو اس کے کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے گا - لیکن اس کے لئے بھی ایک مہلت ہمارے علم کامل اور ہماری حکمت بالغہ میں معین ہے، اس سے پہلے آپ جلدی نہ کیجئے: اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۝ — اور جیسے سورۃ الطارق میں ارشاد فرمایا گیا: فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ "پس اے نبی ان کافروں کو اک ذرا کی ذرا ان کے حال پر چھوڑ دیجئے، ان کے لئے جو مہلت ہم نے مقرر کر رکھی ہے ذرا اسکو ختم ہو لینے دیجئے" — ہمارے علم کامل میں ہر چیز کا ایک وقت معین ہے -

تو یہاں پہلی بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اور اس عجلت کے لفظ کی لفظی مناسبت کے ساتھ اسے سورہ قیامہ میں جوڑ دیا گیا کہ عجلت پسندی تو وہ شے ہے کہ وہ نیکی اور بھلائی اور خیر کے لئے بھی پسندیدہ نہیں کجا یہ کہ انسان پر اس عجلت پسندی اور جلد بازی کا بھوت اتنا سوار ہو جائے کہ اسکی ساری جدوجہد اور سعی و محنت کا مقصود و مطلوب صرف یہ عاجلہ یعنی دنیا بن کر رہ جائے تو اس کے جو نتائج نکلیں گے تو اس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو: كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝

دوسرا اہم مضمون جو یہاں بیان ہوا وہ جمع و حفاظت قرآن کا ہے - چونکہ حضورؐ جو جلدی جلدی زبان کو حرکت دے کر یاد کرنے کی کوشش فرماتے تھے، اس میں یہ اندیشہ بھی ہوتا تھا کہ میں کہیں کچھ بھول نہ جاؤں - کہیں وحی الٰہی کا کچھ حصہ ضائع نہ ہو جائے - اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو کمال شفقت کے ساتھ اس سے بری فرما دیا کہ آپ اس مشقت کو اپنے سر نہ لیں: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ "اس قرآن کو تو جمع کر دینا اور اس کا پڑھوانا ہمارے ذمے ہے" — اب جمع کرنے کے بارے میں جان لیجئے کہ اسکی دو صورتیں ہیں - ایک اس کا جمع کر دیا جانا حضورؐ کے سینہ مبارک میں (صلی اللہ علیہ وسلم) - کہ آپؐ کبھی نہیں بھولیں گے: سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ "آپ کو ہم پڑھائیں گے اور آپ ہرگز نہیں بھولیں گے - آپؐ مطمئن رہیئے" پھر اسی جمع قرآن

کا دوسرا معاملہ ہے اسی قرآن کو مصحف کی شکل میں جمع کرنا۔ یہاں معلوم ہوا کہ اس کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی ہے۔ حضورؐ کے سینہ مبارک میں جب قرآن جمع کیا گیا تو ظاہر بات ہے کہ ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا۔ بلا ترتیب جمع کرنا یہاں مراد نہیں ہے۔ اب یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب نزولی اور ہے اور ترتیب مصحف اور ہے۔ اس میں تو کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ یہ نازل ہوا ایک خاص وقت میں اور خاص حالات کے پس منظر میں۔ اور اُس وقت اس کے نزول کی جو ترتیب ہوئی وہ اس وقت کے حالات سے نہایت مناسبت رکھنے والی ترتیب تھی کہ جیسے جیسے حالات تبدیل ہو رہے ہیں، قرآن مجید کی آیات نازل ہو رہی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بروقت رہنمائی حاصل ہو رہی ہے۔ بروقت تسلی مل رہی ہے، بروقت دلجوئی ہو رہی ہے۔ جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں، ان کے بروقت جوابات مل رہے ہیں۔ تو ترتیب نزولی کی حکمت یہ تھی کہ حضورؐ کی دعوت جن جن مراحل سے گزر رہی ہے، آپؐ کی انقلابی جدوجہد کو جن جن موانع سے سابقہ پیش آ رہا ہے۔ ان کی مناسبت سے آیات اترتی چلی جائیں۔

لیکن اس کی جو اصل ترتیب ہے، جو مصحف میں بھی ہے اور یہی لوحِ محفوظ کی ترتیب ہے۔ یہ ابدی ترتیب ہے۔ یہ وقتی حالات کے تابع نہیں ہے۔ لہٰذا دین میں جو اصل حجت ہے وہ یہ ترتیب ہے اور اسی ترتیب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جمع کیا حضورؐ کے سینہ مبارک میں، اور حضورؐ نے اسی ترتیب کے ساتھ اُمت کی طرف منتقل فرمایا ہے۔ یہ بات میں اس لئے واضح کر رہا ہوں کہ بعض حضرات کو ان الفاظ سے مغالطہ ہو جاتا ہے کہ جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کہے جاتے ہیں کہ آنجنابؓ "جامع القرآن" ہیں۔ اس سے بعض حضرات اس مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شاید یہ قرآن حضرت عثمان رضؓ نے مرتب کیا ہے۔ یہ جمع و ترتیب حضرت عثمان کی ہے۔ معاذ اللہ۔ حضورؐ نے قرآن موجودہ ترتیب کے مطابق مرتب فرما کر اور یہ حضورؐ کا ذاتی عمل نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے ذمے لے رہے ہیں: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ تو موجودہ ترتیب اور جمع کی شکل درحقیقت حضورؐ کی کی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق — اور جیسے کہ عرض کیا گیا یہی ازلی و ابدی ترتیب ہے جس نے لوحِ محفوظ سے بذریعہ وحی حضورؐ پر تنزیل کے بعد

صورت اختیار کی ہے - جو اُمت کے پاس بحمدللہ بعینہٖ اُسی ترتیب کے ساتھ محفوظ و موجود ہے - باری تعالےٰ کے اس ارشاد کے مطابق : اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ہ

البتہ یہ ضرور ہے کہ : "مَا بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ" یعنی جلد کے درمیان ایک کتاب ہوتی ہے - حضورؐ کے زمانے مبارک تک ایک کتاب کی شکل میں قرآن جمع نہیں تھا - سورتوں اور آیات کی ترتیب تھی اور اسی ترتیب سے حفاظ کو قرآن مجید یاد تھا - اسی ترتیب کے ساتھ رمضان المبارک میں حضور حضرت جبرئیل سے مذاکرہ فرماتے تھے اور حیات طیبہ کا جو آخری رمضان ہے اس میں دو مرتبہ پورا مذاکرہ ہوا - تو ظاہر بات ہے کہ وہ کسی ترتیب کے بغیر ممکن نہیں - لیکن اس کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں جو بھی کاتبینِ وحی تھے انہیں جمع کر کے حضرت زید ابن ثابت رضؓ کو ذمہ دار اور ناظم بنا کر اس کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر لیں - چنانچہ پورا قرآن کریم جو اسی ترتیب سے حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا اور جس جس کے پاس بھی مختلف سورتیں تحریری شکل میں موجود تھیں ان سب کے تعاون سے قرآن مجید کتابی شکل میں جمع ہوا -

پھر بعد میں اس کے پڑھنے میں اہل عرب کے مختلف لہجے تھے، جیسے پنجابی زبان کے مختلف Dialects ہیں - اردو زبان کے مختلف لہجے ہیں - لکھنوی لہجہ اور ہے - دہلی کا لہجہ اور ہے - حیدرآبادی لہجہ اور ہے - تو مختلف لہجوں کا اثر اس کی کتابت و قرأت میں بھی آ رہا تھا - اس کو حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک کتابت پر امت کو جمع کر دیا ہے ——— قرآن مجید کو جمع کرنے والے حضرت عثمانؓ نہیں ہیں بلکہ اُمت کو قرآن پر جمع کرنا یہ ہے آپ کا کارنامہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ - جس کے لئے واقعہ یہ ہے کہ اُمت تا قیامِ قیامت ان کے زیرِ بار احسان رہے گی -

یہ بات سورہ قیامہ کی ان آیات سے ثابت ہوتی ہے کہ : اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ ہ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ہ "اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا بھی اور اس کا پڑھوانا بھی، تو پھر جب ہم اسے پڑھوائیں

تو آپ اس ترتیب سے اسے پڑھیئے"۔ ترتیبِ نزولی تو ایک وقتی ضرورت کی بات تھی جو ختم ہوئی لیکن مستقل ترتیب وہ ہوگی جس ترتیب سے ہم پڑھوائیں گے۔

اس کے بعد فرمایا کہ: ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ ۝ "پھر ہمارے ذمّے ہے اسکی تبیین اور توضیح و تشریح بھی"۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ اس کے دو حصّے ہیں ان کو اچھی طرح جان لیجئے۔ ایک حصّہ تو یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں بعض احکام نازل ہوتے تھے، یا بعض باتیں بیان ہوتی تھیں، ان کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوالات پیدا ہوتے تھے تو بعد میں توضیحی آیات نازل ہوتی تھیں۔ ایسی آیات بعض اوقات تو اسی حکم کے ساتھ شامل کر دی گئی ہیں بعض اوقات آگے کسی مقامات پر اس کی توضیح کر دی گئی اور بعض اوقات اُسے اسی سورت کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے جس سورت میں وہ بات آئی تھی۔ اس کی نمایاں مثال سورۂ نساء میں ہے۔ یہ تینوں مثالیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ ایسی آیات کے ساتھ آپ اکثر دیکھیں گے کہ یہ الفاظ آتے ہیں: کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ ۝ "اس طرح اللہ اپنی آیات کی وضاحت فرما دیتا ہے۔ تبیین فرما دیتا ہے۔

ایک تو تبیینِ قرآن یعنی قرآن مجید کی مزید تشریح و توضیح خود قرآن سے ہو گئی اور اس کا دوسرا انتظام یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرضِ منصبی قرار دیا گیا کہ اے نبیؐ ہم نے آپؐ پر جو یہ قرآن نازل فرمایا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ ۔ تاکہ آپؐ اس ذکر یعنی قرآن کو واضح کریں، آپ تبیین کریں، توضیح کریں، تشریح کریں، لوگوں کے لئے اس چیز کی جو ان کے لئے نازل کی گئی ہے ــــ اور یہ جو بعض حضرات کو مغالطہ ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن مجید پر سنّتِ رسول اللہ علیٰ صاحبہ الصلاۃ والسلام کا اضافہ کیا جائے تو گویا یہ قرآن کی توہین ہے۔ یہ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مکمل نہیں ہے اور قرآن اپنی وضاحت کے لئے سنت کا محتاج ہے۔ معاذ اللہ۔ قرآن کے متعلق یہ تصوّر ہم ہرگز نہیں رکھ سکتے۔ اور نہ ہی ہم قرآن کے لئے کسی طور پر بھی لفظ محتاج استعمال نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ ہم ضرور کہیں گے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام کے محتاج ہیں۔ یہ احتیاج ہماری ہے کہ فہمِ قرآن کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوالِ مبارکہ۔ آپؐ کے افعال۔ آپؐ نے قرآن مجید پر جس طرح عمل

کرکے دکھایا ہے ۔ تعلیماتِ قرآنی کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دائروں میں جطرح Demonstrate کیا ہے، اس کے حوالے سے قرآن کو سمجھیں گے اور اس پر عمل کریں گے اور یہ سنت بھی درحقیقت قرآن مجید ہی کا حصہ ہوگی چونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاموں کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے ۔ تبیین حضورؐ نے فرمائی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے ذمّے لے رہے ہیں ۔ اس کی ایک مثال سورہ انفال سے پیش ہے ۔ وہاں ارشاد فرمایا کہ اے نبی آپؐ نے غزوہ بدر میں کنکریوں کی مٹھی بھر کر جو کفّار کی طرف پھینکی تھی تو اُسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب فرما رہے ہیں : وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ تو معلوم ہوا کہ ع ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ۔ تو بسا اوقات اللہ تعالیٰ حضورؐ کے کام کو اپنی طرف منسوب فرماتے ہیں ۔

اس سورۂ مبارکہ میں یہ آیات : اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ اگرچہ سورت کے مرکزی مضمون، اس کے عمود کے اعتبار سے تو ہم کہیں گے کہ ضمناً آئی ہیں ۔ لیکن ویسے یہ آیات نہایت اہمیت کی حامل ہیں ۔ نہایت اساسی امور ہیں جو ان تین چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان فرمائے گئے ہیں ۔ بڑی بنیادی باتیں ہیں جو ان آیات کے ذریعے واضح ہوتی ہیں ۔ اس پر سورہ قیامہ کا ہمارا مطالعہ اور اس پر قدرے غور و فکر ختم ہوتا ہے ۔ اس ضمن میں جو کچھ آج عرض کیا گیا ہے اس کے متعلق کوئی اشکال یا سوال ہو تو میں حاضر ہوں ۔

سوال وجواب

سوال : ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا ہے کہ بعض اوقات نیک کاموں میں جو عجلت ہوتی ہے، وہ اچھی بات نہیں ہے جبکہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ اور ایک جگہ آیا ہے: وَسَارِعُوْا فِى الْخَيْرٰتِ ۔ تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب : بہت عمدہ سوال ہے ۔ اصل میں سَارِعُوْا فعل امر ہے ۔ مسارعت سے ۔ باب مُفاعلہ سے ۔ اس میں اصل مفہوم ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش ۔

اسے عجلت پسندی نہیں کہا جا سکتا ہے ۔ مسابقت کا جذبہ بھی فطرتِ انسانی میں موجود ہے کہ انسان اپنے دوسرے ہم نوع لوگوں سے آگے نکلنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید مسابقت کے اس جذبے کے رُخ کو خیر کی طرف موڑ دینا چاہتا ہے ۔ بجائے دُنیا میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے کے تم بھلائیوں میں، نیکیوں میں، خیر میں، اچھائیوں میں، عبادات کی بجا آوری میں، دین کے احکام اور اوامر و نواہی کے اہتمام میں، دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو ۔ اصل میں وَ سَارِعُوْا ، کا اصل رُخ ان باتوں کی طرف ہے۔ باقی ہر کام کے لئے جو اس کی مناسب تدریج ہے ۔ اس کے لئے جو مناسب وقت لگنا چاہیئے اس کا لحاظ ضروری ہے ۔ اب اگر نماز ہے اور آپ بہت جلدی جلدی پڑھ رہے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ نماز نہیں ہوئی: صَلِّ، فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ ۔ نماز کے ہر رکن کا حق آپ کو پورے سکون اور ٹھہراؤ کے ساتھ ادا کرنا ہوگا ۔ اسی طرح نمازِ جمعہ کے بارے میں فرمایا گیا کہ جب نمازِ جمعہ کے لئے اذان ہو جائے تو اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ - یہاں سعی سے دوڑنا مراد نہیں ہے اس لئے کہ نماز کے لئے دوڑنے سے حضورؐ نے منع فرمایا ہے - یہ وقار اور سکینت کے منافی ہے لہٰذا یہاں کہا جائے گا کہ اپنے تمام کاموں سے اپنا ذہنی تعلق توڑ کر جمعہ کی نماز کی طرف لپکو - ہمہ تن اُسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ ۔

حضرات ! آج کی اس نشست میں سورہ قیامہ کا مطالعہ اور مختصر وقت میں اس کے اتھاہ مطالب و مفاہیم پر جس درجے بھی ممکن ہو سکا غور و فکر اختتام پذیر ہوا ۔ اب آئندہ سبق کے بارے میں نوٹ کر لیجئے کہ سورہ حٰمٓ السجدہ چوبیسویں پارے میں ہے اس کی آیت ۳۰ تا ۳۶ پر مشتمل ہوگا - آپ حضرات اس کا مطالعہ کر کے تشریف لائیں اور سامعین کرام اس کا متن سامنے رکھیں گے تو یقیناً اس کے سمجھنے میں مفید ہوگا ۔

رَبَّنَا زِدْنَا اِيْمَانًا وَّهُدًى وَّعِلْمًا نَّافِعًا وَّعَمَلًا صَالِحًا
وَّرِزْقًا حَلَالًا طَيِّبًا ط اٰمِيْنَ يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ه

اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۵)

غزوۂ بدر، مسلح تصادم کا آغاز

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد، کا سلسلہ وار خطاب

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد فقد قال اللہ تعالیٰ فی سورۃ الحج ۔

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۝

وَقَالَ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فی سورۃ البقرہ ۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ

وَقَالَ اللہ تعالیٰ فی ھٰذہ السُّوْرۃ

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ ج وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ج وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ط وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

وَقَالَ اللہ تعالیٰ فی سورۃ الصف ۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ

صدق اللہ العظیم

رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی ۔

حضرات! گذشتہ چار جمعوں سے اس اجتماعِ جمعہ میں جو گفتگو چل رہی ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ اس کا عنوان ہے "اسلامی انقلاب اور اس کے مراحل، مدارج و لوازم" آج اس سلسلہ کی پانچویں تقریر ہے ۔ آپ حضرات کے لئے تو ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک مشہور کہاوت کے مطابق 'جمعہ جمعہ آٹھ دن' ہوتے ہیں ۔ لیکن میں چونکہ ہفتہ کے دوران سفر میں رہتا ہوں ۔ لہٰذا مجھے یہ عرصہ بہت طویل محسوس ہوتا ہے اسی لئے میں یہ ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ سابقہ سلسلہ کلام کو ابتداً جوڑوں ۔ میں

کسی طویل اعادہ کے بجائے صرف چند اہم نکات کا اعادہ کروں گا۔ ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ کسی بھی حقیقی اور واقعی انقلاب کے چھ یا سات مراحل ہیں، اور یہ مراحل درحقیقت میں نے سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے اخذ کئے ہیں اس لئے کہ میرے نزدیک حضورؐ کا برپا کیا ہوا انقلاب ایک ، بھرپور اور کامل انقلاب تھا۔ اور ایک انسانی زندگی میں اُس کے جملہ مراحل طے پا گئے تھے۔ اس اعتبار سے اگر انقلابی عمل کو سمجھنا ہو تو اس کے لئے واحد ذریعہ (Source) سیرۃ النبیؐ ہے۔ اس انقلاب کے تین مراحل تمہیدی و ابتدائی نوعیت کے ہیں اور اندرونِ ملک کی حد تک تین مراحل تکمیلی ہیں۔ پھر ساتواں مرحلہ اس انقلاب کی بیرونِ ملک توسیع کا ہے۔ ورنہ کسی ملک کے اندر انقلاب کے چھ مراحل ہیں۔

پہلا مرحلہ یا پہلا قدم ہے کسی انقلابی نظریہ کی نشر و اشاعت۔ انقلابِ محمدی علیٰ صاحب الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں اس نظریہ کا ماخذ قرآن ہے۔ جیسے اشتراکی نظریہ کا ماخذ ہے " Das Capital " جو کارل مارکس نے لکھی تھی جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا۔ ع " نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب!"۔ بہرحال انقلابِ محمدیؐ کے ضمن میں انقلابی نظریے کا ماخذ ہے قرآن۔ تمام تر دعوت و تبلیغ اسی قرآن کے ذریعے سے ہوگی اور اس میں جو مرکزی چیز ہے وہ عقیدۂ توحید ہے۔ اسی کے جو معاشرتی، معاشی اور سیاسی متضمنات، مقتضیات، اور مضمرات، ہیں، ان سب کو جمع کیجئے تو یہ ہے درحقیقت "انقلابِ محمدیؐ کا نظریہ"

پہلا انقلابی قدم ہوگا نظریۂ توحید کی دعوت و تبلیغ بذریعہ قرآن مجید۔

دوسرا مرحلہ یا دوسرا قدم یہ ہوگا کہ جو لوگ اس نظریہ کو تسلیم، اور اس دعوت کو قبول کریں، انہیں منظم کیا جاتا ہے۔ اس تنظیم کی بنیاد کے ضمن میں اہم ترین بات یہ ہے کہ جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا وہ ہمہ تن، ہمہ وجود اور ہمہ جہت حضورؐ کا مطیعِ فرمان ہو گیا، اور جماعت میں شامل ہو گیا۔ یہ سب سے زیادہ فطری اور سب سے زیادہ مضبوط تنظیم ہے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ کسی انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ تنظیم نئی ہو۔ سابقہ نظام میں جو تنظیمی ہیئتیں ہوتی ہیں، ان کے ذریعے انقلاب نہیں آیا کرتا — وہ پھر Coup ہوتا

ہے - کوئی موجود منظم ادارہ کسی وقت موقع پاکر حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے - اسے انقلاب نہیں کہتے - انقلاب کے لیئے ایک نئی انقلابی پارٹی کا وجود میں آنا لازمی ہے جس کی نئی درجہ بندی ہو، یعنی نئے Cardres ہوں - اس میں سابقہ معیارات کی بنیاد پر لوگوں کی درجہ بندی نہ ہو بلکہ درجہ بندی کا واحد معیار یہ ہو کہ کون اس نظریہ سے کتنی گہری وابستگی رکھتا ہے اور اس انقلاب کے لیئے کتنی قربانی دے سکتا ہے، اور کتنا ایثار کر سکتا ہے - کسے باشد! - جو ان اعتبارات سے مستعد ہوگا وہ آگے آجائے گا - چاہے سابقہ نظام میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہو - جو ان معاملات میں پیچھے رہے گا نئے نظام میں اس کا شمار پیچھے رہنے والوں میں ہوگا - خواہ سابقہ نظام میں وہ سرداروں اور چودھریوں میں سے کیوں نہ ہو!

تیسرا مرحلہ اور قدم ہے تنظیم - اس لیئے کہ جن لوگوں نے اس نظریہ کو صدقِ دل سے قبول کیا ہے - اگر انہیں تیار نہ کیا جائے ان کی تربیت نہ ہو، وہ پختہ نہ ہوں تو انقلاب نہیں آسکتا — واضح رہے کہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحب الصلوٰۃ والسلام کی تربیت میں روحانی اور اخلاقی اقدار مقدم ہیں - تاہم اس کے ساتھ ساتھ حتی الوسع مادی تیاری کا اہتمام بھی کرنا ہوگا — چوتھا مرحلہ Passive Resistance یعنی صبر محض کا مرحلہ ہے - میں تفصیل کے ساتھ یہ عرض کر چکا ہوں کہ اصل میں تصادم کا آغاز داعی انقلاب اور اس کی جماعت کی جانب سے ہوتا ہے اس لیئے کہ جس معاشرے میں کوئی داعی انقلاب اپنی دعوت کا آغاز کرتا ہے تو اس معاشرے کا اپنا ایک تسلسل ہوتا ہے، اس کی بہت سی روایات ہوتی ہیں، جنہیں ایک تقدیس کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے - اس معاشرے کے رسوم و رواجات کو بھی محترم سمجھا جاتا ہے - پھر یہ کہ اس معاشرہ میں جو مظلوم ہوتے ہیں وہ بھی اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہو کر قانع ہو چکے ہوتے ہیں وہ اس ماحول کو ذہناً قبول کر چکے ہوتے ہیں - چنانچہ اس معاشرہ میں جو شخص کھڑا ہو کر اعلان کرتا ہے کہ یہ نظام غلط ہے، ظالمانہ ہے، باطل ہے وہ گویا تصادم کا آغاز کر رہا ہے — اس معذرت خواہانہ انداز کو ختم کر دینا چاہیئے کہ تصادم مخالفین کی طرف سے ہوتا ہے - واضح رہنا چاہیئے کہ اس تصادم کا آغاز کیا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے -

جیسے میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ ایک تالاب ہے جس کی سطح پر کوئی حرکت و ارتعاش نہیں ہے۔ اس میں آپ جب پتھر ماریں گے تو اس میں لہریں اٹھیں گی اور پورے تالاب میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گی۔ یوں سمجھئے کہ اس معاشرہ پر، جس کی رگ وپے میں شرک، بت پرستی، اوہام رچے بسے تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نعرہ لگا کر پہلا پتھر مارا۔

لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

تمہارے یہ سارے معبود باطل ہیں۔ تمہارا یہ تمام نظام فاسد اور استحصالی ہے۔ مکہ کے لوگ خوب سمجھتے تھے کہ اس نعرہ کے معنی کیا ہیں وہ جانتے تھے کہ یہ نعرہ بغاوت ہے۔ یہ ہمارے نظام کے لئے بڑا خطرناک چیلنج ہے۔ اب ان کی طرف سے اپنے نظام کے تحفظ کے لئے تشدد شروع ہوا۔ اس بات کو پیش نظر رکھیئے کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ انہیں اپنے نظام کا تحفظ کرنا تھا۔ اپنے مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔

میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں کہ اس تشدد کا آغاز زبانی ایذا سے ہوا۔ اور اس ایذا رسانی کا اصل ہدف خود صرف حضورؐ کی ذات مبارک تھی۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہنا شروع کیا۔ پاگل ہو گئے ہیں، آسیب کا سایہ ہے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے۔ شاعر ہیں، کاہن ہیں، ساحر ہیں۔ کوئی عالم فاضل عجمی غلام ہے اُسے گھر میں بند کیا ہوا ہے اس سے (Dictation) املا لیتے ہیں اور ہم پر آکر دھونس جماتے ہیں کہ مجھ پر آسمان سے یہ وحی نازل ہوتی ہے۔ مشرکین مکہ کی یہ تمام باتیں قرآن میں نقل ہوئی ہیں۔ پھر انہوں نے دوسرے حربے بھی استعمال کیئے ہیں: وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِھِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّکْرَ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّہٗ لَمَجْنُوْنٌ[1] ان سارے ہتھکنڈوں کا مقصد کیا ہوتا ہے کہ داعی اوّل کے اعصاب کو متاثر کر دیا جائے۔ اس کی ہمت توڑ دی جائے۔ اس کی قوت ارادی میں تزلزل پیدا کر دیا جائے۔ کردار کشی کی کوشش ایسے ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ

---

[1] اور بالکل قریب تھا کہ کافر آپ کو اپنی تیز نگاہوں سے پھسلا دیں جبکہ انہوں نے قرآن سنا اور کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے۔

اگر اس طریقے سے داعی اعصاب شکنی (Nervous Breakdown)

کا شکار ہو جائے تو انقلاب کی ساری بات ختم! دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت سب کچھ اسی کے دم سے ہوتی ہے۔ لہٰذا پہلے تین سال جو تشدد ہوا ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا ہے کسی اور پر نہیں ہوا۔ کسی اور سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ اس تمام عرصہ میں حضورؐ ہی کو ہدف بنایا گیا ہے اور آپ کو ذہنی اذیتیں پہنچائی گئی ہیں۔ آپ کو نفسیاتی کوفت پہنچائی گئی ہے۔ ذہنی اذیت اور کوفت پہنچانے کے اس دور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ کو مختلف اسالیب سے تسلی دی جاتی رہی ہے: اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَہْزِءِیْنَ ۝ "اے نبی! ان استہزاء اور تمسخر کرنے والوں کے لئے آپؐ کی طرف سے ہم کافی ہیں"۔ اور: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ۝ "اور اے نبی! ہمیں خوب معلوم ہے۔ کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپؐ کا سینہ بھنچتا (تنگ ہوتا) ہے"۔ یعنی آپ کو صدمہ پہنچتا ہے۔

اس کے بعد اگلا مرحلہ آیا۔ جب مشرکین نے تجربہ کر لیا کہ اس استہزار اور تمسخر سے نہ تو حضورؐ کی ہمت پست ہوئی اور نہ آپؐ کی دعوت رُکی بلکہ انہوں نے دیکھا کہ آپؐ کی دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہے تو جسمانی تشدد شروع ہوا۔ ایمان لانے والوں کو مارو۔ ان کو ستاؤ۔ ان کو دہکتے انگاروں پر لٹاؤ۔ نوجوانوں کو گھروں سے نکال دو۔ یا ان کو خوب اذیت پہنچاؤ۔ جیسے حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہوا کہ انؓ کو ایک چٹائی میں لپیٹ کر انؓ کی ناک میں دھونی دے دی گئی۔ یہ تشدد (Persicution) نبوت کے چوتھے سال سے شروع ہوا اور ۵ نبوی میں نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ چنانچہ حضورؐ نے چند صحابہؓ کو اجازت دے دی کہ تم حبشہ ہجرت کر جاؤ۔ اس تشدد کا سلسلہ دس برس تک چلتا رہا ہے۔ اس عرصے کو میں صبر محض (Passive Resistance) کا دور قرار دیتا ہوں یہ صبر محض کیا ہے! یہ کہ مسلمانوں کو ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی: کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ۔ اپنے ہاتھ بندھے رکھو، روکے رکھو۔ ماریں کھاؤ لیکن ڈٹے رہو، قدم پیچھے نہ ہٹے۔ اپنے موقف سے سرمو انحراف نہ ہو۔ مگر جوابی کارروائی کی اجازت نہیں ہے۔ یہ مرحلہ پورے مکی دور میں

جاری رہا ہے۔

غزوۂ بدر کا پس منظر اس کے بعد ہجرت کے ساتھ ہی مراحل انقلاب میں سے پانچواں مرحلہ یا یوں کہیے کہ تصادم کا دوسرا مرحلہ (Phase) شروع ہو گیا جس پر تفصیلی گفتگو میں پچھلی مرتبہ کر چکا ہوں: حکم آ گیا: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا "اجازت دے دی گئی ہے ان کو جن پر جنگ ٹھوسی گئی ہے۔ اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا ہے"۔ یہاں سے جس کا آغاز ہوا اُس کا عنوان ہے 'اقدام' یعنی (Passive Resistance) — اُس اقدام کی نوعیت کیا تھی! وہ میں گذشتہ مرتبہ تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ ربیع الاوّل ۱ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے۔ ابتدائی چھ ماہ تک تو آپؐ نے مکہ کے خلاف کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ آپؐ نے یہ چھ مہینے داخلی استحکام پر صرف فرماتے ہیں۔ سب سے پہلا کام مسجد نبویؐ کی تعمیر یعنی مرکز کا قیام تھا۔ دوسرا کام آپؐ نے یہ کیا کہ انصار اور مہاجرین رضوان اللہ علیہم کے مابین مواخات قائم کی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سگے بھائیوں سے زیادہ مضبوط وہ رشتے تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین کے درمیان قائم فرمائے۔ اور تیسرا کام تھا یہود کے ساتھ معاہدے اور ان میں ان کو جکڑ لینا۔

ان چھ ماہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمیں بھیجنی شروع کیں۔ پچھلی مرتبہ میں نے آٹھ مہموں کی تفصیلات آپ کے گوش گذار کر دی تھیں۔ ان میں سے چار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تشریف لے گئے لہٰذا انہیں غزوات کہا جائے گا۔ اور چار وہ ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف نہیں لے گئے بلکہ آپؐ نے دستے بھیجے کسی صحابیؓ کو ان کا سربراہ بنا کر — ایسی مہمات کو سرایا کہا جاتا ہے۔ یہ آٹھ مہمیں ہیں جن میں چار غزوات ہیں اور چار سرایا۔ یہ ہیں اقدامات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوہ بدر سے پہلے پہلے۔ میں پچھلی مرتبہ یہ بات آپ کو وضاحت سے بتا چکا ہوں کہ جدید اصطلاحات کے حوالے سے ہم یوں کہیں گے کہ حضورؐ نے دو کام بیک وقت کیے۔ ایک تو وہی جس کی دھمکی رئیس خزرج حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ دے کر آئے تھے جس کا ذکر پچھلی مرتبہ تفصیل سے آ چکا ہے کہ وہ (یعنی حضرت سعد) اس دوران مکہ گئے تھے۔ امیہ ابن خلف کے یہاں مقیم ہوئے، جو ان کا حلیف

تھا۔ اس کے ساتھ طواف کے لئے گئے۔ جب ابوجہل نے ان کو دیکھا اور اُسے معلوم ہوا کہ یہ مدینہ کے رہنے والے ہیں تو اس نے طیش میں آکر اُن سے کہا کہ تم وہی ہو جنہوں نے ہمارے بھگوڑوں کو پناہ دی ہے۔ اگر تم امیہ ابن خلف کے حلیف نہ ہوتے تو خدا کی قسم بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ اس پر حضرت سعدؓ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ "اگر تم نے ہم پر طواف بند کیا تو ہم بھی تمہارے قافلوں کے شام کے راستہ کو تمہارے لئے مخدوش بنا دیں گے"۔ اس کو جدید اصطلاح میں ہم کہیں گے Economic Blockade یعنی قریش کی معاشی ناکہ بندی۔ چونکہ ان کی معیشت کا سارا انحصار شام اور یمن کے راستوں سے تجارت پر تھا۔ لہٰذا حضورؐ نے پہلا اقدام یہ کیا کہ ان راستوں پر اپنی Presence یعنی اپنی موجودگی کا احساس دلا کر اُن کے تجارتی راستے کو مخدوش بنا دیا۔ ان اقدامات کا دوسرا مقصد تھا کہ جو قبیلے اس علاقہ میں آباد ہیں اُن سے اوّل تو معاہدے کر لیے جائیں اور ان کو مسلمانوں کا حلیف بنا لیا جائے۔ لیکن اگر یہ نہ ہو تو ان کو غیر جانب دار ضرور بنا لیا جائے اور ان کے ساتھ یہ طے ہو جائے کہ وہ قریش کے مقابلے میں نہ مسلمانوں کی مدد کریں گے اور نہ ہی مسلمانوں کے مقابلہ میں قریش کی مدد کریں گے۔ اس علاقے میں جو متعدد قبائل آباد تھے حضورؐ نے ان سے یہ معاہدے کر لئے۔ اس کو جدید اصطلاح میں ہم کہیں گے Political Isolation of Quresh یعنی قریش کی سیاسی ناکہ بندی۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ ۱۹۶۷ء کی جو عرب اور اسرائیل جنگ شروع ہوئی تھی خلیج عقبہ کی ناکہ بندی (Blockade) سے شروع ہوئی تھی۔ صدر ناصر مرحوم نے اسرائیل کی ایلات کی بندرگاہ کو Block کر دیا تھا۔ جس کے ردِّ عمل میں اسرائیل نے بھرپور جوابی کارروائی کی۔ اور اس چھ روزہ جنگ میں نہایت ذلت و ہانت آمیز عرب کی تین متحدہ حکومتوں کو شکست ہوئی تھی۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کا قبلہ اوّل بیت المقدس بھی اسرائیلی قبضہ میں چلا گیا تھا اور تا حال اس کے قبضہ میں ہے۔ یہ اہم واقعہ ذہن میں رکھیئے۔ تو جس طرح کے آجکل واقعات ہوتے ہیں، اُسی طرح کے اُس زمانہ میں بھی ہوتے تھے۔ لیکن یہ کہ ہم اُس زمانہ کی تاریخ کا سائنٹیفک طریقہ پر اور تجزیاتی انداز میں مطالعہ نہیں کرتے اور اس سے جو نتائج نکلتے ہیں ان پر غور و فکر نہیں کرتے۔ بس ہمارے

ذہنوں پر چونکہ ایک تقدس کا ہالہ ہوتا ہے تو ان واقعات کے بین السطور جو اسباب ہوتے ہیں۔ ان تک ہمارے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سیرت کے واقعات کو اُن کے صحیح پس منظر (Perspective) کو سمجھیں۔

مختصراً یہ کہ مدینہ تشریف لے جاکر حضورؐ نے چھ ماہ داخلی استحکام میں لگائے اور اس کے بعد رمضان ۱ھ میں مہمیں بھیجنے کا اقدام فرمایا۔ غزوہ بدر رمضان ۲ھ میں ہوا ہے تو ایک سال کے اندر آٹھ مہمیں حضورؐ نے بھیجی تھیں، جن کا ذکر میں گذشتہ تقریر میں کر چکا ہوں۔ ان میں سے دو کی یاد دہانی کرا دیتا ہوں۔ ایک تو وہ جو ذوالعشیرہ کے نام سے موسوم ہے، اس مہم میں حضورؐ کے قریباً دو ماہ لگے ہیں۔ اس کا مقصد اس قافلہ کا راستہ روکنا تھا جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام جا رہا تھا۔

اُس مہم میں ڈیڑھ سو مہاجرین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تیس اونٹ تھے تو اتنی بڑی قوت کے ساتھ حضورؐ نکلے تھے۔ گویا غزوہ بدر سے آدھی قوت اس مہم میں شریک تھی۔ میں نے اس کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ مجھے ان حضرات کی تردید کرنی ہے کہ جو مستشرقین کے الزامات سے مرعوب ہو کر یہ معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی اقدام نہیں ہوا۔ اور یہ کہ مدینہ والوں پر تو جنگ تھوپی گئی تھی، اس لئے اپنی مدافعت میں مسلمانوں کو تلوار اٹھانی پڑی[1]۔ معذرت خواہی کا یہ دور اب ختم ہو جانا چاہیئے۔ تاریخ، سیرت مطہرہ اور خود قرآن اس پر گواہ ہے کہ ہجرت کے بعد تمام اقدامات نبی اکرم صلی اللہ علیہ

---

[1] سرسید مرحوم نے یہ معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا تھا۔ مولانا شبلی مرحوم کا بھی یہی انداز ہے۔ حالانکہ سیرت پر ان کی کتاب بڑی مستند کتاب ہے۔ لیکن وقت کے دباؤ میں وہ بھی آ گئے۔ وہ تو مولانا سلیمان ندویؒ نے جو مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد تھے اور انہوں نے اس کتاب کی بعد میں تکمیل کی ہے۔ اپنے استاذ مرحوم کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اس مقام پر بڑا مدلل حاشیہ لکھا ہے کہ اور ثابت کیا ہے کہ غزوہ بدر کا اصل سبب وہ اقدامات تھے جو حضورؐ نے اس سے قبل قریش کے قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنانے کے لئے کیے تھے۔

وسلم کی طرف سے ہوتے ہیں۔ جن میں ایک تو یہ ذوالعشیرہ والا غزوہ بہت اہم ہے۔ دوسرا وادی نخلہ کا واقعہ جو فیصلہ کن ہو گیا اور یہ ہوا اُسی دوران میں جبکہ ابوسفیان کا قافلہ بچ کر سوئے شام جا چکا تھا۔ یہ واقعہ جمادی الثانی کے آخری دن ہوا تھا۔ جس میں قریش کے ایک قافلے سے مسلمانوں کی مُڈبھیڑ ہو گئی اور مکّہ کا ایک شخص عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ وادی نخلہ وادی ہے کہ سنہ نبوی میں جب حضورؐ طائف کے سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے تو آپؐ جب یہاں فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اس وقت جنّوں کا ایک گروہ اس وادی میں سے گزرا جس نے قرآن سنا اور حضورؐ پر ایمان لے آیا۔ جس کا ذکر سورہ الجنّ میں ہے: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ۔ وادی نخلہ میں عمرو ابن عبداللہ الحضرمی کا قتل قریش کے لئے ناقابلِ برداشت بن گیا۔ اس کا باپ امیہ بن حرب کا حلیف تھا جو ابوسفیان کا باپ تھا جو اس وقت قریش کا سردار تھا۔ مکّہ میں نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ خون کا بدلہ خون۔

یہ دونوں واقعات ذہن میں رکھیئے چونکہ یہ اصل سبب بنے ہیں غزوہ بدر کے اور غزوہ بدر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انقلابی جدوجہد کا اندرون عرب آخری اور چھٹا مرحلہ مسلّح تصادم (Armed Conflict) شروع ہوا ہے۔ اب اس کو سمجھنے کے لئے آپ ذرا مکّہ کی صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھیئے۔ تاکہ صحیح پس منظر سامنے رہے۔ جیسا کہ میں نے پچھلی تقریر میں عرض کیا تھا کہ وہاں مزاج کے لحاظ سے دو طرح کے سربرآوردہ لوگ تھے۔ اس مزاجی تفاوت کے لئے پچھلی مرتبہ میں نے آپ کو دو جدید اصطلاحات سنائی تھیں Hawks and Doves (اردو میں کہہ سکتے ہیں کہ جنگ پسند اور امن پسند) یہ دو مزاج آپ کو ہر معاشرہ میں ملیں گے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں بہت جوشیلے بہت جنگجو۔ بڑے جذباتی۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہر قیمت پر دشمن کو کچل دیا جائے، نیست و نابود (Crush) کر دیا جائے۔ انہیں Hawks کہا جاتا ہے اور کچھ لوگ ہوتے ہیں متحمل مزاج حلیم الطبع، مدبّر، وہ معاملات کے روشن و تاریک پہلوؤں کو خوب دیکھتے بھالتے اور جانچتے ہیں۔ ان کو خون ریزی طبعاً بُری لگتی ہے۔ مقصد ایک ہو تب بھی ایک طریقہ ہے کسی کو زہر دے کر مارنا اور

ایک ذریعہ ہے کسی کو گڑوے کر مارنا۔ تو Hawks زہر دے کر مارنے کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ جبکہ Doves کا مقصد بھی دشمن کو ہلاک کرنا ہوتا ہے لیکن وہ زہر کے بجائے گڑوے کر مارنا چاہتیں گے۔ تو مکہ میں ان دونوں قسموں کے لوگ تھے۔ جہاں تک Hawks کا تعلق ہے ان کا سب سے بڑا شخص ابوجہل تھا۔ ابوسفیان کو بھی جب تک وہ ایمان نہیں لائے تھے، اسی فہرست میں شمار کیجئے۔ تیسرا شخص عقبہ ابن ابی معیط Hawks کا بہت نمایاں شخص ہے۔ چوتھا شخص نضر ابن حارث یہ بھی ان کا نمایاں شخص ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن اور خون کے پیاسے تھے۔ ہجرت کے بعد ہی سے ان کا اصرار تھا کہ مدینہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن وہاں امن پسند یعنی Doves بھی تھے اور کافی با اثر تھے۔ ان میں نمایاں شخص حضرت خالد سیف اللہ رضی اللہ عنہ کے باپ ولید ابن مغیرہ کا انداز مصالحانہ تھا۔ لیکن بدر سے پہلے وہ مر چکا تھا۔ ابوسفیان کا خسر، سند کا باپ بھی Doves میں سے تھا یعنی شریف النفس انسان تھا۔ اسی طرح حکیم ابن حزام جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے، بہت ہی شریف النفس انسان تھے ——— حضورؐ کو جب شعب بنی ہاشم میں پورے خاندان بنو ہاشم کے ساتھ محصور کیا ہوا تھا۔ یہ بھی ان اشخاص میں خاص طور پر شامل تھے جن کا نام ان لوگوں میں آتا ہے کہ جو انسانی ہمدردی کے جذبہ سے رات کی تاریکی میں چھپ چھپا کر پہاڑ کی چوٹی کو عبور کر کے محصورین کو کھانے پینے کی کچھ چیزیں پہنچایا کرتے تھے۔ چونکہ وادی کے دونوں سروں پر پہرہ رہتا تھا۔ اس لئے پہاڑی کو عبور کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں ان کا نام اس لئے بتا رہا ہوں کہ غزوہ بدر میں ان کا ایک خاص رول ہے۔ جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ حکیم ابن حزام بعد میں ایمان لے آئے تھے لہذا صحابہ میں شامل ہیں، رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔

یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ حضورؐ کی ہجرت کے بعد ہی سے ان امن پسند لوگوں یعنی Doves اور جنگ پسند لوگوں یعنی Howks میں رسہ کشی چلتی رہی ہے۔ ابوجہل جو Hawks کا نمایاں ترین شخص تھا، وہ اور اس کے قبیل کے لوگ مصر تھے کہ مدینہ پر چڑھائی کی جائے تاکہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔

(صلی اللہ علیہ وسلم، و رضی اللہ عنہم) لیکن یہ Doves روکتے تھے کہ جب ہماری مصیبت ٹل گئی تو اب ہم کیوں فکر مند ہوں! جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں موجود تھے۔ ہمیں اندیشہ رہتا تھا کہ ہمارے نوجوانوں میں کوئی متاثر ہوکر آج ایمان لے آئے گا کوئی کل! اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اب یہ بات ختم ہوئی۔ عتبہ ابن ربیعہ کی نہایت مدبرانہ بات، جسے سیاسی اعتبار سے شاہکار کہا جا سکتا ہے، یہ تھی کہ اس نے مشورہ دیا تھا کہ تم اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عرب کے حوالے رہنے دو، یعنی اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عرب کے دوسرے قبائل کے مابین کشمکش ہوگی۔ ہم سے تو نہیں ہوگی۔ ہمارے سر سے تو بلا ٹلی۔ ظاہر بات ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نچنت ہوکر بیٹھنے والے نہیں ہیں، وہ تو اپنی دعوت و تبلیغ جاری رکھیں گے تو اب تصادم دوسرے قبیلوں سے ہوگا۔ تو اس نے مشورہ دیا کہ اب تم Watch کرو اور دیکھو کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اگر تو اہل عرب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ختم کر دیں۔ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ۔ تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اور تم اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے سے بچ جاؤ گے۔ آخر اہل ایمان اور مشرکین مکہ بھائی بند ہی تو تھے۔ حمزہ رضی اللہ تعالٰی عنہ اُدھر تھے تو عباس اِدھر تھے دونوں عبدالمطلب کے بیٹے تھے کہ نہیں۔ علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالٰی عنہ حضورؐ کے ساتھ ہیں تو عقیل ابن ابی طالب مشرکین کے ساتھ ہیں۔ باپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہ اُدھر ہیں تو ان کے بیٹے عبدالرحمٰن اِدھر ہیں۔ تو عتبہ نے بڑا صائب مشورہ دیا کہ: ہمیں اپنے عزیزوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی ضرورت کیا ہے! اگر بقیہ عرب قبائل محمدؐ کو ختم کر دیں تو جو تم چاہتے ہو، وہ حاصل ہو جائے گا اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) غالب آ گئے تو بھی ہمارا کیا گھاٹا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آخر قریشی ہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ پورے عرب پر قریش کی سیادت و حکومت قائم ہو جائے گی۔ اس مشورے سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ عتبہ ابن ربیعہ کا اندازِ فکر کیا تھا!۔

لیکن یہ دو واقعات ایسے ہو گئے کہ جنگ پسندوں (Hawks) کو موقع ہاتھ آ گیا[1] ایک طرف وہ شخص چیختا ہوا پہنچ گیا جو وادی نخلہ کی مڈبھیڑ میں مسلمانوں کے ہاتھوں

---

[1] ان واقعات کی تفصیل ماہِ نومبر کے میثاق میں وضاحت سے آ چکی ہے (ادارہ)

سے بچ نکلا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آدمیوں نے ہمارا قافلہ لوٹ لیا اور ہمارے ایک آدمی عمرو بن عبداللہ الحضرمی کو قتل کر دیا اور دو کو پکڑ کر لے گئے۔ اس سے مکہ میں جو کہرام مچا اُس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ اور میں نے نوٹ کرایا تھا کہ ہجرت کے بعد پہلا جھنڈا بھی حضورؐ نے بلند فرمایا۔ پہلا تیر بھی حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے چلایا اگرچہ اس سے کوئی زخمی نہیں ہوا تھا۔ اور وادی نخلہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں پہلا قتل بھی ہوا، دو کافر قید ہوئے اور قافلہ کا تمام ساز و سامان مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ دوسری طرف ابوسفیان کی طرف سے S.O.S. call پہنچ گئی جو شام سے قافلہ لے کر واپس آ رہا تھا۔ کہ سامان بہت زیادہ ہے محافظ صرف پچاس ہیں اور خطرہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قافلہ پر حملہ کریں۔ چونکہ جب قافلہ جا رہا تھا تب بھی حضورؐ نے پیچھا کیا تھا لہٰذا اُسے یقین تھا کہ واپسی میں قافلہ پر تاخت ہو گی۔ ممکن ہے کہ اُسے اطلاع ملی ہو کہ حضورؐ قافلہ پر حملہ کا قصد فرما رہے ہیں واللہ اعلم۔ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع ہو گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ Hawks کی بن آئی اور ایک ہزار جنگجوؤں کا کیل کانٹے سے تیار ہو کر لشکر نکلا۔ ابوسفیان کی عدم موجودگی میں قریش کی سرداری ربیعہ ابن عتبہ کے پاس تھی لہٰذا اس لشکر کا سپہ سالار بھی وہی تھا۔ ابوجہل، امیہ ابن خلف، نضر ابن حارث، عتبہ ابن ابی معیط، شیبہ ابن عتبہ اور بہت سے وہ لوگ جو اہل ایمان کے خون کے پیاسے تھے، سب کے سب نکلے۔ اس لشکر کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ سرداران قریش میں سے سوائے ابولہب کے اور کوئی پیچھے نہیں رہا۔ ابولہب بزدل انسان تھا۔ اس نے اپنی جگہ ایک Mercenary یعنی کرائے کا فوجی بھیج دیا کہ میری طرف سے یہ لڑے گا۔ اس شخص میں انسانیت کا کوئی جوہر نہیں تھا وہ بخیل اور بزدل شخص تھا، اُس کی اپنے معاشرہ کے اندر کوئی عزت نہیں تھی۔ لوگ اُسے غزال زرّین کا چور سمجھتے تھے۔ چونکہ یہ کعبہ کے بیت المال کا متولی تھا۔ اور وہاں سے چڑھاوے کے طور پر آیا ہوا سونے کا ہرن چوری ہو گیا تھا تو یہ اُس غزال زرّین کا چور مشہور ہو گیا تھا۔ پس ابولہب کے سوا قریش کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں بچا کہ جس کے تمام سربرآوردہ لوگ اس لشکر میں شامل نہ ہوئے ہوں۔ البتہ ابو

سفیان رہ گئے تھے جو قافلہ کے ساتھ تھے۔ ان کو بھی پیغام بھیج دیا کہ تم بھی اپنی نفری اور سازو سامان کے ساتھ ہم سے آکر مل جاؤ۔ لیکن ابوسفیان کا اس معاملہ میں جو اپنا کیریکٹر ہے اس کا اگر مطالعہ کی جائے تو وہ خود ایک دلچسپ موضوع ہے میں اُسے اس وقت نہیں چھیڑوں گا۔ وہ بہت ہی حقیقت پسند انسان تھے محض جذباتی انسان نہیں تھے۔ انہوں نے دو احتیاطیں کیں۔ ایک طرف مکّہ پیغام بھیج دیا کہ مدد بھیجو۔ دوسری طرف جب ان کو معلوم ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لوگوں کے ساتھ قافلہ کا رخ فرما رہے ہیں تو انہوں نے اپنا راستہ بدلا۔ وہ بدر کی طرف آئے ہی نہیں۔ ساحل بحر احمر کے ساتھ ساتھ ہو کر نکل گئے۔ ابوجہل کا پیغام مل بھی گیا تھا کہ لشکر کے ساتھ آکر شامل ہو جاؤ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ نہیں میں براہِ راست مکّہ جا رہا ہوں۔

غزوہ بدر سے قبل مشاورت

اب آیئے مدینہ کی طرف۔ یہ تو میں نے آپ کو مکّہ کا منظر بتایا۔ مدینہ کے متعلق احادیث صحیحہ سے جو صحیح و معتبر ترین روایت ملتی ہیں وہ یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کسی جنگ کا اعلان کیا نہ تیاری فرمائی۔ بلکہ پیشِ نظر صرف یہ تھا کہ جو قافلہ آ رہا ہے اُسے روکنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بغیر کسی خاص اہتمام اور تیاری کے لوگ نکل کھڑے ہوئے۔ پھر یہ بات نوٹ کیجئے کہ غزوۂ ذوالعشیرہ میں ڈیڑھ سو افراد تمام مہاجرین تھے۔ جبکہ اس غزوہ میں صرف ساٹھ یا تہتر ۷۳ مہاجرین ساتھ ہیں۔ تعداد کے متعلق دونوں روایات موجود ہیں۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر جنگ کا پروگرام ہوتا تو آپؐ خصوصی انتظام فرماتے اور تعداد زیادہ ہوتی۔ پھر یہ پہلی بار ہوا ہے کہ انصاری صحابہؓ بھی ساتھ نکلے ہیں بلکہ تعداد میں وہ زیادہ تھے۔ حضورؐ نے مدینہ میں بھی مشورہ کیا تھا اور پھر مدینہ کے باہر بھی ایک مجلسِ مشاورت منعقد فرمائی ہے لیکن مدینہ کی مشاورت میں جنگ کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا لہٰذا آپؐ نے کسی سے تاکیداً انہیں فرمایا کہ ساتھ چلو۔ مگر انصارؓ بھی خود اپنی مرضی سے ساتھ ہو گئے تھے۔ حضورؐ کی طرف سے کوئی خصوصی ترغیب نہیں تھی۔ اب آپؐ جب مدینہ سے کچھ دور پہنچے ہیں تو آپؐ کو معلوم ہوا کہ مکّہ سے ایک ہزار کا کیل کانٹے سے لیس لشکر سوئے مدینہ نکل پڑا ہے اور منزل بمنزل

طے کرتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ اب یہ دو طرفہ معاملہ ہو گیا کہ شام کی طرف سے قافلہ آ رہا ہے اور جنوب سے لشکر چلا آ رہا ہے۔ اب یہاں مدینہ سے باہر مشاورت ہوتی ہے جو اہم ترین مشاورت ہے۔ قرآن مجید میں سورہ انفال میں جو بیان ہے وہ بہت مختصر ہے چونکہ قرآن مجید ایسے معاملات کو عموماً اختصار سے بیان کرتا ہے۔ ان آیات کے بین السطور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورۃً ہی یہ بات پیش کی ہو گی کہ "مسلمانو! ایک قافلہ شمال سے آ رہا ہے جس کے ساتھ صرف تیس یا پچاس محافظ ہیں۔ مالِ تجارت بہت ہے۔ ایک لشکر جنوب سے آ رہا ہے اور وہ ہے کیل کانٹے سے لیس۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک پر فتح کا وعدہ کر لیا ہے تو بتاؤ کدھر چلیں!" لیکن احادیث میں جو اس کی تفاصیل آئی ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری بات حضورؐ نے ابتداءً نہیں فرمائی۔ اس کی میں آگے وضاحت کروں گا۔ میرے نزدیک قرآن مجید میں پوری صورتِ حال کو Sum up کر دیا گیا ہے حضورؐ نے ابتداءً مشورہ طلب جو بات رکھی وہ یہی تھی کہ ایک ہے وہ قافلہ اور ایک ہے لشکر بتاؤ کدھر چلیں۔ اب ان حالات میں کچھ لوگوں کی مخلصانہ سوچ تھی انہوں نے تجویز کیا کہ حضورؐ قافلہ کی طرف چلئے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ تجویز پیش کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات ہو گی کہ قافلہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پچاس کی نفری ہے۔ آسانی سے قابو میں آ جائیں گے۔ ساز و سامان تجارت بھی بہت ہاتھ لگے گا اور اسلحہ بھی جو آئندہ جنگ میں کام آئیں گے۔ لیکن حضورؐ جیسے کچھ منتظر سے تھے۔ تب لوگوں نے اندازہ کیا کہ منشاءِ مبارک کچھ اور ہے، حضورؐ کا اپنا رجحانِ طبع کچھ اور ہے۔ اُس مرحلے پر مہاجرین نے تقریریں شروع کیں کہ حضورؐ! آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں، جو آپ کا ارادہ ہو، بسم اللہ کیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے تقریر کی، حضورؐ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے تقریر کی۔ لیکن حضورؐ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ایسا نظر آ رہا ہے اور محسوس ہو رہا تھا جیسے حضورؐ کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔ حضرت مقداد ابن اسودؓ بھی مہاجرین میں سے تھے، انہوں نے کھڑے ہو کر وہ الفاظ کہے کہ "حضورؐ جو آپؐ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجئے۔ ہم موسیٰؑ کے ساتھی نہیں ہیں جنہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ: اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا

اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۔" موسیٰؑ تم اور تمہارا رب دونوں جائیں اور جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں آپؐ بسم اللہ کیجئے۔ ہم آپؐ کے ساتھ لڑیں گے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالےٰ آپ کو ہمارے ذریعہ آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمادے" لیکن حضورؐ پھر بھی کچھ انتظار کی کیفیت میں تھے۔ اب خیال آیا حضرت سعدؓ کو کہ حضورؐ کا روئے سخن دراصل انصار کی جانب ہے۔ روایات میں اختلاف ہے کہ یہ کون سے سعدؓ ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ سعد ابن عبادہؓ تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کا قول یہی ہے۔ ایک روایت ہے کہ یہ حضرت سعدؓ ابن معاذ تھے۔ میرا رجحان غالب یہی ہے کہ یہ حضرت سعد ابن عبادہ تھے رضی اللہ عنہ۔ انصارؓ کے دو قبیلے تھے خزرج اور اوس ۔ خزرج کا قبیلہ تعداد میں اوس سے تین گنا تھا اور اسکی طاقت بہت زیادہ تھی۔ خزرج ہی کی ایک شاخ کا سردار تھا عبداللہ ابن اُبی، منافقِ اعظم۔ اور پورے قبیلہ کے سردار تھے۔ حضرت سعد ابن عبادہؓ۔ چنانچہ سردار کی طرف سے کسی رائے کا اظہار گویا پورے قبیلہ کی طرف سے اظہارِ رائے کے مترادف تھا۔ اوس کے سردار تھے حضرتِ سعد ابن معاذؓ۔ بہرحال ان دو میں سے کسی نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ "حضورؐ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے" اس خیال کی وجہ کیا تھی! یہ کہ حضورؐ نے مدینہ (یثرب) تشریف لانے کی، بیعت عقبہ ثانیہ میں جو دعوت قبول کی تھی تو اس میں یہ طے ہوا تھا کہ "اگر یہ قریش مدینہ پر حملہ کریں گے تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں"، گویا انصار اس معاہدہ کی رو سے اس کے پابند نہیں تھے کہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کریں۔ قافلہ کا راستہ روکنا اور بات ہے اور باقاعدہ ایک لشکر جرّار سے جا بھڑنا یہ بالکل دوسری بات ہے۔ لہٰذا اُس معاہدے کی رو سے انصارؓ اس کے پابند نہیں تھے۔ حضرتِ سعدؓ کو فوراً خیال آگیا کہ ہو نہ ہو حضورؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے۔ اس موقع پر حضرتِ سعدؓ نے جو بات کہی ہے وہ ایسی ہے کہ ہر مسلمان کو یاد رہنی چاہیئے اور اس کے مطابق اپنا رویہ اور عمل درست کرنے کی شعوری کوشش کرنی چاہیئے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اس انقلابی عمل میں جماعت وجود میں آئی تھی اس کی دو بنیادیں ہیں۔ اصل بنیاد تو یہ تھی کہ حضورؐ

اللہ کے رسول ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور جو بھی امتی ہے وہ حضورؐ کے ہر حکم کا ہمہ تن، ہمہ وقت، ہمہ جہت پابند ہے۔ مطیع ہے، فرماں بردار ہے: وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ کوئی اضافی عہد ہو یا نہ ہو، کوئی معاہدہ ہو یا نہ ہو۔ کوئی اضافی بیعت ہوئی یا نہ ہوئی ہو۔ مجرد یہ بات کہ وہ حضورؐ پر بحیثیت رسول اللہ ایمان رکھتا ہے وہ حضورؐ کا تابع فرمان ہے۔ یہ بات ہے جو حضرت سعد ابن عبادہؓ رضی اللہ تعالٰی عنہ نے اس موقع پر کہی کہ:

"حضورؐ! شاید آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے! اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنٰكَ۔ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں، ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے۔ ہم نے آپ کو اللہ کا رسول مانا ہے۔ اُس وقت کیا طے ہوا تھا! کیا نہیں ہوا تھا! اس وقت وہ بات irrelevant ہے، غیر متعلق ہے، آپؐ جو بھی حکم دیں گے۔ سِرْ بِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) لے چلئے ہم کو جہاں بھی لے جانا ہو۔ خدا کی قسم اگر آپؐ ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیجئے ہم برق الغمارہ تک جا پہنچیں گے (جو یمن کا آخری کونے کا شہر ہے) اور اس کے لئے ہم اپنی سواریوں کو دبلا کر دیں گے"

حضرت سعد ابن عبادہؓ کی یہ تقریر سن کر آپؐ کا چہرہ مبارک کھل اٹھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جماعت میں حضورؐ کی بیعت ثانوی چیز تھی۔ اس کی اصل بنیاد تو یہ تھی کہ جو آپؐ پر ایمان لائے اور حضورؐ کی تصدیق کرے وہ اس جماعت میں شامل ہے۔ جس نے بھی آپؐ کو اللہ کا رسول مانا ہے، جیسے فرمایا: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝[1] ایمان کہاں رہ جائے گا اگر حضورؐ کا حکم نہ مانیں لہٰذا بڑی پیاری، بڑی بنیادی اور اصولی بات کہی تھی اس وقت حضرت سعد ابن عبادہؓ یا حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالٰی عنہما نے کہ: اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنٰكَ۔

---

[1] سو تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہونگے جب تک کہ اپنے اختلافات میں تجھے منصف نہ مان لیں پھر تیرے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں، اور خوشی سے قبول کریں۔

اس بات سے حضورؐ کا چہرہ انور کھل اٹھا۔ گویا آپؐ انصار کی رائے معلوم کرنے کے منتظر تھے۔ اس موقع پر بعض روایات میں مہاجرین کی تعداد ساٹھ اور بعض میں بیاسی ۸۲ آتی ہے۔ تین سو تیرہ میں سے تیراسی وضع کیجئے تو انصار کی تعداد دو سو تیس بنتی ہے۔

اس مشاورت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش قدمی فرمائی اور پھر بدر پہنچ کر جب معلوم ہو گیا کہ وادی کے دوسرے سرے تک قریش کا لشکر پہنچ چکا ہے تو وہاں آپؐ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کے لئے فرمایا: وہاں کا بھی ایک واقعہ بڑا اہم ہے کہ صحابہؓ میں سے بعض تجربہ کار حضرات نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر یہاں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ وحی کی بنا پر ہے تو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا۔ اگر یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے تو ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ جنگی مہارت اور حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس مقام کے بجائے اُس مقام پر کیمپ ہونا چاہیئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ جہاں تک خالص دنیوی امور کی تدابیر اور تجرباتی علوم کا تعلق ہے تو تابیر النخل کے معاملہ میں آپؐ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُمت کے لئے یہ ہدایت و تعلیم دے دی ہے کہ: اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج ہی ایسا تھا کہ آپؐ دنیوی تدابیر کے معاملہ میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ غزوہ احزاب کے موقع پر خندق کھودنے کا فیصلہ حضورؐ نے حضرت سلیمان فارسیؓ کے مشورہ پر فرمایا تھا۔

اب میں اس جنگ سے ایک رات پہلے کے دو منظر آپ کو اور دکھا دوں۔ ابھی جنگ نہیں ہوتی ہے کہ خبر پہنچ گئی کہ ابو سفیان کا قافلہ بچ کر نکل گیا۔ اب چہ میگوئی شروع ہوئی کہ جنگ کا کیا فائدہ ہے۔ ہم تو اپنے قافلہ کی حفاظت کیلئے آئے تھے۔ اس صورت حال سے Hawks کے مقابلہ میں Doves کے ہاتھ میں پھر ایک دلیل آگئی کہ ہمارا مقصد قافلہ کی حفاظت تھا قافلہ بچ کر نکل گیا پھر جنگ کی ضرورت کیا ہے! چنانچہ قریش کے دو گھرانے بنو زہرہ اور بنو عدی لشکر کو چھوڑ کر چلے گئے کہ اب ہمیں جنگ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اب ہم شریک نہیں رہیں گے۔ اس کو بھی نوٹ کیجئے اکثر حضرات کو اس کا علم نہیں تھا

اس کے علاوہ اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ حکیم ابن حزام، عتبہ کے پاس گئے جو اس لشکر کا سپہ سالار تھا اور اس سے کہا کہ عتبہ! ایک نیکی کا کام تم اس وقت ایسا کر سکتے ہو کہ تاریخ میں تمہارا نام لکھا جائے کہ تم نے بہت بڑا کام کیا۔ عتبہ نے پوچھا کہ اچھا بتاؤ وہ کام کون سا ہے!۔ انہوں نے وہی تجویز رکھی کہ ہمارا قافلہ بچ کر نکل چکا ہے اب اس ہونے والی خوں ریزی کو تم روک سکتے ہو۔ عمرو ابن عبداللہ الحضرمی کا باپ عبداللہ حرب بن امیہ کا حلیف تھا۔ اگر تم اس کی دیت یا خون بہا ادا کر دو تو وہ مسئلہ بھی ختم۔ قافلہ بچ کر نکل ہی چکا ہے۔ پھر جنگ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس خواہ مخواہ کی خون ریزی کو تم روک سکتے ہو۔ عتبہ ابن ربیعہ نے کہا کہ بہت مناسب تجویز ہے۔ وہ خود اسی مزاج کا آدمی تھا۔ لیکن وہ جو Hawks کا سرغنہ۔ ابوجہل موجود تھا، فی الاصل تو اس کو سمجھانا مقصود تھا۔ چنانچہ دونوں اس کے پاس گئے اور اُسے قائل معقول کرنے کی کوشش کی عتبہ نے کہا کہ دیکھو خونریزی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا قافلہ بچ کر چلا گیا۔ عمرو کا خون بہا میں ادا کر دیتا ہوں۔ اب ابوجہل کی چالاکی دیکھئے۔ ایک تو اس نے عتبہ کو طعنہ دیا۔ بزدلی کا طعنہ۔ اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ عتبہ! تم اپنے بیٹے کو سامنے دیکھ کر گھبرا گئے ہو، یاد رہے عتبہ کے بڑے بیٹے حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ حضورؐ کے ساتھ تھے جو سابقون الاولون میں سے تھے۔ عتبہ کا دوسرا بیٹا اس کے ساتھ تھا۔ ابوجہل نے مزید نمک پاشی کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت پدری تمہیں بزدل بنا رہی ہے کہ بیٹا بمقابل ہے اسی لئے تم جنگ ٹالنا چاہتے ہو۔ اس کا عتبہ نے وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر ایک باغیرت باحمیت انسان کو دینا چاہیئے۔ یہ چیزیں تو قریش میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ عتبہ نے کہا کل کا دن بتا دیگا کہ بزدل کون ہے!۔ وہ اس طعنہ کو برداشت نہیں کر سکا۔ ابوجہل نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عمرو ابن عبداللہ الحضرمی کے بھائی کو بلایا اور اس سے کہا کہ دیکھو ہم تمہارے بھائی کے خون کا بدلہ کل لے سکتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جنگ نہ ہو، ۔ اس شخص نے عرب جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنے کپڑے پھاڑے، بالکل عریاں ہو گیا اور شور مچایا وَا عَمْرَاہُ۔ وَا عَمْرَاہُ۔ اسے قبائلی

زندگی میں Blood Cry (خونی چیخ) کہتے ہیں اور یہ سب سے زیادہ مشتعل کرنے والا نعرہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے لشکر میں آگ لگ گئی۔ الغرض مشرکین کے کیمپ میں آخری رات تک یہ کشمکش جاری رہی ہے، کچھ لوگ چاہتے تھے کہ جنگ ٹل جائے۔ لیکن ابوجہل نے ان کوششوں کو اپنی چالاکی سے ناکام بنا دیا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور فیصلہ ہو گیا کہ بہرصورت کل جنگ ہوگی۔ چنانچہ دوسرے دن جنگ ہوئی۔

مشرکین کی دُعائیں

اب ایک چیز اور نوٹ کیجئے جو آپ کو شرک کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد دے گی۔ مشرکین مکہ میں سے دو اشخاص کی غزوہ بدر شروع ہونے سے متصلاً قبل رات کی دعائیں کتب تاریخ میں نقل ہوئی ہیں۔ حضورؐ نے بھی اسی شب کو دُعا کی ہے جس کا ذکر آگے کروں گا۔ میں اس وقت دو مشرکین کی دُعائیں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ تاریخ میں ایک ابوجہل کی اور دوسری نضر ابن حارث کی دعا منقول ہوئی ہے۔ میں ذکر یہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ دونوں مشرک تھے، اللہ کے منکر نہیں تھے۔ قرآن میں بار بار آتا ہے کہ جب تم پر کوئی مشکل وقت پڑتا ہے تو تم اپنی دیویوں اور من گھڑت معبودوں کو بھول جاتے ہو اور صرف اللہ کو پکارتے ہو۔ یہ دلیل آپ کو قرآن میں مل جائے گی چنانچہ ابوجہل کی دُعا منقول ہے۔ اَللّٰھُمَّ مَنْ اَقْطَعُنَا لِلرَّحِمِ فَاَحِنْہُ الْغَدَاۃَ "اے اللہ! جس نے ہمارے رحمی رشتے کاٹے ہیں کل تو اُسے ذلیل کر دیجیو"۔ یہ اس شخص کی پکار ہے جس کی گھٹی میں قوم پرستی، نسل پرستی، قبائل پرستی پڑی ہوئی تھی، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کا سب سے بڑا الزام یہی تھا کہ انہوںؐ نے آکر اپنی دعوت و تبلیغ کی بدولت ہمیں تقسیم کر دیا۔ ہماری اولاد کو ہم سے جدا کر دیا۔ بھائیوں کو ایک دوسرے سے کاٹ دیا۔ ہماری جو قوت تھی، وہ تو اس طور پر پراگندہ ہو گئی۔ ہمارے رحمی رشتے محمد نے منقطع کر دیئے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) ابوجہل کا سب سے بڑا الزام یہی تھا۔ چونکہ صلہ رحمی کو تو ہمیشہ سے ایک بھلائی اور خیر تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور قطع رحمی ایک برائی سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ اللہ کو اس کا واسطہ دے رہا ہے کہ مقابلہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم

جو لشکر لے کر آئے ہیں، انہوں نے قطع رحمی کی ہے۔ اس نے دُعا کی کہ اے اللہ! کل تو اُسے رسوا کر دے جس نے ہمارے رحمی رشتے منقطع کئے ہیں: اَللّٰھُمَّ مَنْ اَقْطَعَنَا لِلرَّحِمِ فَاَھِنْہُ الْغَدَاۃَ — اور نضر ابن حارث کی جو دُعا منقول ہوئی ہے اس کو پڑھ کر میں سخت حیران ہوا ہوں کہ ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کی شخصیتیں اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں، جن کی سوچ اس قدر غلط ہو چکی تھی کہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں سے ہم بہتر جماعت ہیں۔ اس کی دُعا منقول ہوئی ہے کہ: اَللّٰھُمَّ انْصُرْ خَیْرَ الْحِزْبَیْنِ — یہ جو دو حزب بالمقابل آگئے تھے ہمارے نزدیک تو ایک حزب اللہ اور ایک حزب الشیطان لیکن ان کی رو سے ان کے دین کے باغیوں کا حزب اُن کے سامنے تھا اور وہ تھے اپنے آبائی دین اور اپنی قوم کے وفادار۔ آمنے سامنے دو حزب ہیں اور وہ یہ سمجھ کر دُعا کر رہا ہے کہ ہماری جماعت بہتر ہے حق پر ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! ان میں سے بہتر جماعت کی مدد فرمائیو۔ اللہ نے اس کی دعا تو ایک لحاظ سے قبول فرمالی جو بہتر گروہ تھا اسکی مدد فرمائی۔

غزوہ بدر کے موقع پر حضورؐ کی دُعا

دوسری طرف اسی رات کو حزب اللہ کے لشکر میں اس گھانس پھونس کی جھونپڑی میں جو آپؐ کے لئے بنائی گئی تھی۔ رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین، سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طویل ترین سجدہ کیا ہے، طویل ترین دُعا کی ہے۔ اس دُعا میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اے اللہ! کل اگر یہ لوگ یہاں قتل ہو گئے، شہید ہو گئے تو پھر قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اور تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اب اس کو پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ حضورؐ نے ایسا کیوں فرمایا! اس لئے کہ آپؐ آخری نبی اور رسول تھے اور آپؐ کے بعد تا قیام قیامت کوئی نبی آنے والا نہیں تھا۔ حضورؐ نے بارگاہ ربّ العزت میں مزید عرض کیا۔ بارِ الٰہا! میں نے اپنی پندرہ برس کی کمائی میدان میں لاکر ڈال دی ہے۔ اس وقت تلوار لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ پہرے پر کھڑے تھے جس وقت حضورؐ سربسجود تھے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ الفاظ

حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے

سنتے ہیں تو انہوں نے عرض کیا : حَسْبُكَ، حَسْبُكَ یَارَسُولَ اللّٰہِ! بس کیجئے بس کیجئے
یقیناً اللہ آپؐ کی مدد فرمائے گا۔ اس پر حضورؐ نے سر مبارک اٹھایا اور زبان مبارک
پر یہ الفاظ جاری ہوتے : سَیُھْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۔ گویا اللہ کی طرف
سے خوشخبری تھی کہ "اس جمعیت کو شکست ہو کر رہے گی اور یہ پیٹھ دکھا کر
بھاگیں گے"۔

سیرتِ نبویؐ سے متعلق بعض اہم نکات

بہرحال اس غزوہ بدر سے چھٹا اور آخری مرحلہ شروع ہوتا ہے ۔ یعنی مسلح تصادم Armed Conflict میں نے ہجرت کے بعد کے دو برس کی جو تاریخ آج بھی دہرادی ہے تو یہ ہے ۔ Active Resistance کا مرحلہ ۔ اقدام ہوا حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ۔ لیکن پہلی باقاعدہ جنگ ہوئی ہے غزوہ بدر ۔ اس معاملہ میں اس بحث میں پڑنا کہ جنگ کس نے شروع کی ، کس نے نہیں کی ۔ آیا اسلام میں صرف دفاعی (Defence) جنگ کی اجازت ہے یا Offence جنگ یعنی خود حملہ میں پہل کرنا بھی درست ہے ۔ سوال یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باطل کا قلع قمع کرنے کیلئے بھیجے گئے تھے یا باطل کو Acknowledge (تسلیم کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے! حق باطل کو کبھی تسلیم اور برداشت کر سکتا ہے !۔ ایک ہی شکل ہے کہ حق کے نام لیوا اگر بے حمیت اور بے غیرت ہو گئے ہوں، ان کو زندگی زیادہ عزیز ہو گی تو وہ حق کو مغلوب دیکھ سکتے ہیں ۔ ورنہ غیور، باحمیت حق کے ماننے والے اور حق کے علمبردار، باطل کا وجود کبھی گوارا نہیں کر سکتے ! حق کے پاس اگر طاقت ہو تو وہ یقیناً جارح ہو گا ۔ صرف ایک فرق ذہن میں رکھیے ۔ کسی فرد (

حاشیہ ص ۶۸

؁ اس موقع پر ایک بات یاد آگئی ۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں آنجنابؓ کے فرزندگان میں سے کسی نے آپؓ سے پوچھا کہ صحابہ کرامؓ کی جماعت میں سب سے زیادہ شجاع، دلیر اور بہادر کون تھا ؟ ۔ سوالی کا خیال تھا کہ آنجناب اپنا نام لیں گے ۔ لیکن حضرت علیؓ نے جواب دیا وہ شخص کہ جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر سے پہلے والی شب کو اپنی جھونپڑی پہ پہرے کے لئے معین فرمایا تھا یعنی ابو بکر صدیق (مرتب)

(Individual) کو نہ کبھی پہلے اپنا دین بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ نہ آئندہ کیا جائیگا۔ اس کے لیئے قرآن حکیم کی نص موجود ہے : لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ "دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہے۔ بیشک ہدایت کی راہ گمراہی سے جُدا ہوکر روشن واضح ہو چکی ہے"۔ لیکن باطل کا غلبہ! یہ گوارہ نہیں کیا جائے گا۔ ملک میں تشریعی نظام (Law of the Land) بہرصورت اللہ کا قائم ونافذ ہوگا : اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ اگر اہل حق میں کوئی غیرت وحمیت ہے تو وہ حق کا بول بالا کرنے اُسے غالب کرنے اور باطل کو مٹانے' اُسے سرنگوں کرنے کی جدوجہد کے لیئے تن، مَن، دھن سب کچھ لگا دیں گے۔ اس راہ میں جان دینے اور سر کٹانے سے زیادہ دنیا میں ان کو کوئی شئے محبوب نہیں ہو گی۔ اقبال نے بڑا پیارا شعر کہا ہے۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق وباطل نہ کر قبول

جسے Pieceful Co-existance کہا جاتا ہے یعنی دو متضاد فکری نظام پُرامن طریق پر پہلو بہ پہلو رہیں، تو باطل تو چاہے گا کہ یہ صورت برقرار رہے۔ اس لیئے کہ اُسے تو اس طرح اپنے وجود اور بقاء کی ضمانت Lease of Existance ملتی ہے۔ لیکن یاد رکھیئے کہ حق وباطل کے مابین Pieceful Co-existance خود باطل ہے۔ حق اسے کیسے گوارا کر لے گا! ۔ اسی لیئے میں پورے وثوق کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ مکہ میں بھی تصادم کا آغاز جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ جب یہ نعرہ لگایا :۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

ان کے عقائد کی نفی' ان کے نظام کی نفی' ان کے رسم ورواج کی نفی' ان کے رزائلِ اخلاق کی نفی ۔ ان کے معاشرتی نظام کی نفی، معاشرتی اونچ نیچ کی نفی ۔ نسل پرستی کی نفی آباء پرستی کی نفی، ہوائے نفس کی نفی ۔ بتایئے کہ اس کلمہ توحید کی زد سے باطل نظریات کا کون سا پہلو اور گوشہ بچ سکتا ہے ۔ الغرض ہر چیز کی نفی ۔ اس کلمہ میں موجود ہے ۔

ہجرت کے بعد اقدامات بھی حضورؐ نے کئے صلی اللہ علیہ وسلم - کہاں وادی نخلہ! وہاں مہم بھیجی ہے - ابوسفیان کا قافلہ جب جا رہا تھا تب بھی اس میں خلل اندازی Intercept کرنے کے لئے حضورؐ بنفسِ نفیس ڈیڑھ سو مہاجرین کے ساتھ اس کے تعاقب میں نکلے ہیں - میں حیران ہوتا ہوں کہ مولانا شبلی مرحوم غزوہ ذوالعشیرہ کا ذکر تک نہیں کرتے - ہمیں ان سے ہمدردی ہے - اس لئے کہ وہ انگریز کا دور تھا - مستشرقین کی طرف سے پے بہ پے حملے ہو رہے تھے کہ ع "بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے -!" لہٰذا معذرت خواہانہ انداز تھا - انہوں نے لکھا ہے کہ ابوسفیان کا قافلہ جب واپس آ رہا تھا تو ایسے ہی خبر اڑ گئی کہ حضورؐ شاید اس پر حملہ کرنے والے ہیں - حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دو تین مہینے پہلے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قافلے کو Intercept کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے - وہ تو ایک دن رات کا فصل پڑ گیا کہ قافلہ بچ کر نکل گیا - مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں کہ ہمارے سیرت نگاروں نے خواہ مخواہ ایسی باتیں لکھ دی ہیں - اس دور میں عجیب عجیب جملے ملتے ہیں - کوئی صاحبِ قلم یہ لکھتے ہیں - "فلاں فلاں مسائل میں ہمارے فقہاء اصل حقیقت کو سمجھ نہیں پائے - وغیرہ" گویا ہمارے فقہاء ان کے نزدیک کودن تھے - اور عقل و فہم سے عاری تھے آج کے دور کے لوگوں کو عقل آئی ہے - وہ اب پڑھائیں گے امام ابوحنیفہ کو، امام مالک کو، امام شافعی کو، امام احمد ابن حنبل کو اور ان کے جلیل القدر تلامذہ کو - رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کہ دیت کا معاملہ کیا ہے! عورت کی دیت کتنی ہونی چاہیئے! مرد کے برابر ہونی چاہیئے! نہ کہ نصف - اور یہ کہ رحم تو خاص حالات میں بطور تعزیر ہے نہ کہ مستقل اسلامی حد ہے - ہمارے فقہاء نے گویا ان مسائل کو سمجھا ہی نہیں - اسی طرح یہ کہ "ہمارے سیرت نگاروں نے فلاں معاملہ میں یہ لکھ دیا وہ لکھ دیا!" تو سوال یہ ہے کہ آپ کے پاس کون سا خصوصی ذریعہ علم ہے! - یہ سارا کچھ ملا تو وہیں سے ہے - اگر آپ غزوہ بدر کو ایک واقعہ ماننے کو تیار ہیں تو وہ ہمیں کہاں سے معلوم ہوا! انہی سیرت نگاروں نے بتایا تو ہمیں معلوم ہوا - قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے - لیکن جس طرح سیرتِ مطہرہ

میں اس کی کڑیاں جڑ کر آئی ہیں اُس طرح واقعات قرآن مجید میں نہیں ملیں گے ۔ اجمالی تبصرہ ہے جو قرآن میں ملتا ہے ۔ واقعات کی تفصیل کے لئے تو سیرت کی کتابیں ہیں البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ اگر واقعات کی کوئی کڑی کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے تو دوسری کتابوں میں مل جاتی ہے ۔ ان سب کا مجموعی مطالعہ کرکے اور ملا کر واقعات وحالات کی واضح اور مکمل تصویر بن جاتی ہے۔ وادیٔ نخلہ کا واقعہ سیرت کی تمام کتابوں میں چونکہ موجود ہے لہذا اس کو ماننے پر سب مجبور ہیں اور یہ تسلیم کیا گیا ہے ۔ کہ اس واقعہ نے مکّہ میں آگ لگائی ہے ۔

ایک بات میں اور عرض کر دوں ۔ حضورؐ مکّہ سے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ جان بچا کر نہیں بھاگے تھے ۔ جس کسی کا بھی یہ تصوّر ہو وہ اس کی اصلاح کرلے ۔ ہمارے کچھ تجدّد پسند دانشور، مستشرقین کی تحریروں سے متاثر ہو کر ایسا تصوّر رکھتے ہیں کہ یہ حضرات ہجرت کے واقعہ کا ذکر Flight to Madinah ، یعنی مدینہ کی طرف فرار کے الفاظ سے کرتے ہیں ۔ وہ اسے ہجرت نہیں کہتے ۔ ہجرت اور فرار میں زمین وآسمان کا فرق ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس تصوّر کا ذرا سا شائبہ بھی کسی کے ذہن میں ہو تو وہ اسے کھرچ دے ۔ ورنہ یہ بالکل ویسے ہے جیسے سورہ انفال میں آیا ہے کہ جنگ میں پیٹھ دکھا دینا بہت بڑا جرم، ناقابلِ معافی گناہ ہے سوائے اس کے کہ پینترا بدلنا مقصود ہو ۔ یا یہ کہ پیچھے جو فوج ہے اس تک پہنچ کر پھر حملہ کرنا مقصود ہو ۔ تو ہجرت کیا تھی! ہجرت درحقیقت باطل کے خلاف پینترا بدلنا تھا ۔ ایک متبادل مرکز (Alternate Base) ۔ کی حیثیت سے حضورؐ نے پہلے طائف کا انتخاب کیا تھا ۔ طائف والوں کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی ۔ اللہ تعالےٰ نے یہ خوش قسمتی اور سعادت یثرب کے لئے رکھی تھی کہ اہل یثرب چل کر گئے اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دے آتے، منظوری لے آتے ۔ اب حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس گھڑی کی اجازت ملنے کا انتظار تھا جس گھڑی ہجرت کرنی تھی ۔ جوں ہی اجازت آئی حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم عازمِ ہجرت ہوئے اور سوئے یثرب کوچ فرمایا ۔ لیکن حضورؐ یہاں کھجوروں کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام

فرمانے نہیں آئے تھے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ۔ ؎

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

چھاؤں سب کو پسند آتی ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو غزوہ بدر سے پہلے بنفسِ نفیس چار مہموں میں تشریف لے گئے ہیں ۔ حضورؐ نے تو ٹھنڈی چھاؤں میں آرام نہیں کیا ۔ ابتدائی چھ مہینے کا زیادہ سے زیادہ معاملہ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ خود کسی غزوے کے لئے تشریف لے گئے نہ کوئی سریہ بھیجا ۔ یہ چھ ماہ حضورؐ نے جس کام میں لگائے ہیں اس کو میں بیان کر چکا ہوں ۔ وہ داخلی استحکام اور اقامتِ صلوٰۃ، اجتماعاتِ مسلمین کے لئے مسجد نبویؐ کی تعمیر نیز انصار و مہاجرین میں مواخات سے متعلق تھا ۔ ان کاموں کو سنبھالنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اقدامات کا آغاز فرما دیا ۔ تو یہ ہے Active Resistance (اقدام) جس کا آغاز ہوا نبی اکرمؐ کی طرف سے ۔ جس کے نتیجہ میں آخری اور چھٹے مرحلے یعنی مسلح تصادم کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے ۔ غزوہ بدر اس کا آغاز ہے ۔

تاریخ ہے ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ ۔ ابوجہل سے ایک بات اور بھی منسوب ہے کہ اس نے دعا کی تھی کہ "اے اللہ! اس جنگ کو یوم الفرقان بنا دے" اللہ تعالیٰ نے اس دن کو حق و باطل میں امتیاز کرنے والا دن بنا دیا اور سورہ انفال میں اس کو "یوم الفرقان" ہی قرار دیا ۔ واقعہ یہ ہے کہ ہجرت اور غزوہ بدر ہی دین اللہ کے بالفعل غلبہ کی تمہید بنے ۔

غزوہ بدر کے بعد چھ سال تک یہ سلسلہ (Phase) اندرون ملک جاری رہا ۔ اس پر ان شاء اللہ تعالیٰ اب آئندہ جمعہ میں گفتگو ہوگی ۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَ لَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَ نَفَعَنِيْ وَ اِيَّاكُمْ بِالْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝

(جاری ہے)

نزلہ، زکام اور کھانسی

سے محفوظ رہنے کی آسان تدبیر

مناسب احتیاط برتئے۔ بروقت سُعالین لیجیے

جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ سُعالین کا باقاعدہ اور بروقت استعمال گھر کے ہر فرد کو نزلہ، زکام اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک دو ٹکیاں روزانہ چوسیے۔

سُعالین کے چار قرص تیز گرم پانی میں گھول لیجیے، جوشاندہ تیار ہے جو نزلہ، زکام اور کھانسی کے لیے بدرجہا مفید ہے۔ ایسی ایک خوراک صبح و شب پیجیے۔

سُعالین

نزلہ، زکام اور کھانسی کی مفید دوا

ہمدرد

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

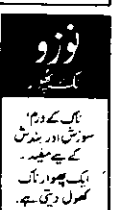

ادارۂ اخلاق

وقت ایسی زمین ہے جس میں محنت کے بغیر کچھ نہیں پیدا ہوتا۔

Adarts SUA-2/84

مُسلم پرسنل لا کی صحیح نوعیّت واہمیّت

> پیشِ نظر مقالہ وہ خطبہ ہے جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، (صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا کانفرنس منعقدہ کلکتہ ۶، ۷، ۸، اپریل ۱۹۸۵ء میں بحیثیت صدر بورڈ کے ۷ اپریل کو بورڈ کے اجلاس میں زبانی ارشاد فرمایا تھا، اس اجلاس میں مسلمانانِ ہند کی تمام دینی وسیاسی جماعتوں، مسلم تنظیموں، اور مختلف مکاتبِ خیال کے ذمہ داروں، مسلم دانشوروں، اور سربرآوردہ علماء اور قانون دانوں کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔

حضرات! سب سے پہلے میں اس بات پر معذرت کرتا ہوں کہ میں اس اہم موقع پر کوئی لکھا ہوا خطبہ پیش نہیں کر رہا ہوں، میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اندرونی اور بیرونی سفروں میں مشغول رہا، اور مسلسل انہماک اور مصروفیت رہی، لیکن اس غیر ارادی اور اضطراری کوتاہی میں خیر کا بھی ایک پہلو ہے، تیار کیے ہوئے بلند پایہ خطبہ ہائے صدارت کی افادیت اور اہمیت کو کم کیے بغیر جو اب ہماری علمی، ادبی وسیاسی تاریخ کا جزء بن گئے ہیں، میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ بعض مرتبہ خطبۂ صدارت کل کا کل یا اس کا کوئی جزء بے محل یا بعد از وقت ثابت ہوتا ہے، اور حالات میں تغیر کی وجہ سے اپنی تازگی اور برجستگی کھو چکا ہوتا ہے، اس لیے شاید اس میں بھی حکمتِ الٰہی کو دخل ہو کہ اس فضاء میں تازہ حالات کے مطالعہ کے بعد آپ سے براہِ راست خطاب کر رہا ہوں۔

حضرات! کسی بھی مسئلہ سے اختلاف یا کسی حقیقت سے گریز اور مخالفت کا باعث صرف مخالفت کا جذبہ، عناد یا سیاسی مصالح اور مفادات ہی نہیں ہوتے، اکثر غلط فہمی یا ناواقفیت یا ناقص واقفیت (جسے میں ناواقفیت سے زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں) اس کی ذمہ دار ہوتی ہے، افراد اور خاندانوں کی سطح پر بھی، ملتوں اور قوموں کی سطح پر بھی اور ملکوں اور سلطنتوں کی سطح پر بھی ایسی غلط فہمیاں، ناواقفیت اور ناقص واقفیت بڑے اہم اور سنگین نتائج کا سبب بنی ہے، اور قوموں، تہذیب وتمدن، سلطنتوں اور مذاہب کی تاریخ اس کی شہادتیں پیش کرتی ہے کہ بعض مرتبہ کسی غلط فہمی، ناواقفیت یا ناقص واقفیت کی بناء پر بے ضرورت جنگیں برپا ہو گئی ہیں، سلطنتیں سلطنتوں سے ٹکرائی ہیں، اور بعض اوقات وحشتیں وحشتوں سے نہیں وحدتیں وحدتوں سے ٹکرائی ہیں۔

مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں بھی نہ ہم کو اس کی ضرورت ہے نہ اس کا شوق ہے کہ ہم ان سب لوگوں کے بارے میں جو ملّتِ اسلامیہ کے دائرے سے باہر ہیں، یا ان گروہوں، عناصر یا مکاتب خیال پر جو مسلم پرسنل لا کے مخالف ہیں اور جو ہندوستان پر یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کے داعی اور اس کے حامی ہیں، یہ الزام لگائیں کہ ان میں مخالفت ہی کا جذبہ یا عناد کام کر رہا ہے، میرا خیال ہے کہ اس میں غلط فہمی اور زیادہ تر ناقص واقفیت کو دخل ہے۔

مسلمانوں کے عائلی قانون کی اہمیت اور صحیح حیثیت کیا ہے؟ اس کے متعلق میں دو حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، اور اُن سب حضرات کو جو مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے عادی ہیں، اور ان میں حُبّ الوطنی کا جذبہ ہے اور ان کا ذہن تخریبی Destructive نہیں بلکہ تعمیری (Constructive) اور حقیقت پسند (Realistic) واقع ہوا ہے، اور وہ صداقت کو قبول کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں دو بنیادی حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، اور اس مؤقر مجلس کے توسط سے صحافت اور ابلاغ عامّہ (Public Media) کے سنجیدہ اور ذمہ دار ذرائع سے میں اپنی آواز دور دور تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

۱۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ (Comparative Study) کی روشنی میں جس کا میں ایک طالب علم ہوں۔ ان تمام آسمانی مذاہب کے بارہ میں کہہ سکتا ہوں جو صحیفے رکھتے ہیں، اور جن کے یہاں نبوّت کی تاریخ ہے لیکن میرے لیے زیادہ محتاط صورت یہ ہے کہ میں اس دین کی طرف سے عرض کروں جس سے میرا اور آپ کا انتساب ہے کہ اس کی ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں کے ذریعہ، سماجی خدمتگاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (Reformers) یا بانیانِ سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا، یہ سارے گروہ قابلِ احترام ہیں، لیکن کسی دین میں اور کسی تہذیب، نظامِ فکر، دبستان (School of thought) اور خالص مطالعہ غور و فکر، اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل سرحدی لکیر (Line of Demarcation) ہے، جو ایک کو دوسرے سے جُدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، یہ حدِ فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) اُن برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوّت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعتِ مطالعہ اور وسعتِ نظر کے اظہار کے لیے

وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں، جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب و تمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں، یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقے پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حدِ فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفہ، سماجیات کا علم (Social Sciences) تہذیب و تمدن (Civilization) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ، یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے ان کا احترام کرتے ہیں، اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب و تمدن اور فکر و دانش کا ایک مستقل مدرسہ (School of thought) بھی ہے، لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک دین ہے، اور اس دین کو دنیا میں پیش کرنے والے اور اس کو بروئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، اور یہ اُن کی زبان اور اُن کا طرزِ فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا، بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا، اور وہ ان کے لیے اسی درجہ قابلِ احترام اور قابلِ اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لیے اور سارے اُمتیوں کے لیے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (وہ خواہش نفس سے منہ سے بات نہیں نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے) مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (آپ نہیں جانتے تھے کہ کھنا پڑھنا کیا ہوتا ہے، ہم نے اس کو ایک نُور کی طرح آپ کے سینہ میں اُتارا، اور اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک (اے محمدؐ) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو)

اچھے اچھے سنجیدہ اہلِ علم اور اہلِ فکر اس مغالطہ میں ہیں، اس پر انہوں نے اپنی عمریں گذار دیں۔ ایک کُتب خانہ تیار ہو گیا، اور اس نے غیر ضروری طور پر ایک مہم اور ایک معرکہ آرائی (Conflict) کی شکل اختیار کر لی ہے، حالانکہ اس کی کوئی بنیاد نہیں، سیدھی سی بات یہ ہے کہ آپ جس دین کے ماننے والوں کو مخاطب کرتے ہیں، اُن سے توقع اور مطالبہ کرتے ہیں، ان کو مشورہ دیتے ہیں، پہلے اُن کا مزاج اور اُن کا امتیاز سمجھ لیں، وہ پیغمبروں کی ایک ایسی جماعت اور اس جماعت ——— کے خاتم اور اس جماعت کے فردِ اکمل کے تابع ہیں، جس کا رشتہ وحیِ الٰہی سے تھا، اور وہ خود وحی کا انتظار کرتا تھا، بیسیوں حدیثیں ہیں، جو میں اس وقت آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتا کہ لوگ پُوچھنے آئے آپ نے کہا انتظار کرو، اور آپ خود انتظار کرتے رہے، اور بعض مرتبہ تو ایسا ہوا کہ وسائل موجود ہے، اور آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور کسی صحابی نے اپنے دوست سے کہا کہ دیکھو، تم دیکھنا چاہتے تھے کہ وحی کس طرح آتی ہے تو دیکھ لو، بعض دفعہ ایسا ہوا

کہ ساق مبارک کسی کی ساق پر تھی، اور وحی کا نزول شروع ہوا، وہ کہتے ہیں کہ قریب تھا کہ میری ٹانگ ٹوٹ جائے، اتنا بوجھ تھا، اس لیے کہ وحی کے ساتھ ایک بوجھ ہوتا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس مادی دنیا سے آپ کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے، اور آپ کسی اور عالم میں ہیں، اور اس کے بعد آپ نے وحی کے الفاظ سنانے شروع کیے، ایک مرتبہ کفار نے اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا، آپ نے وحی کا انتظار کیا، یہاں تک کہ کئی روز (پندرہ دن) گزر گئے اور کفار کو اعتراض کا موقعہ مل گیا، جب سورۂ کہف نازل ہوئی تب اس کا جواب آیا، اور اللہ تعالیٰ نے وہ قصہ سنایا، آپ نے اس طرح سنایا جیسے کوئی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

وحی و نبوت کا فرق اساسی فرق ہے ہمیں غیر مسلم بھائیوں اور غیر مسلم فضلا سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی و نبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں، کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت سے حضرات ناآشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی کی ذہانت کا انکار ہے اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی یا نفسیاتی تجزیہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی مقتضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارے میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں، عدالت میں پہلی بات یہ طے کی جاتی ہے کہ نہیں بحث کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ یہاں بڑے بڑے تجربہ کار قانون دان موجود ہیں، ان کو پہلے اپنی سند وکالت پیش کرنی ہوتی ہے اگر معلوم ہے فاضل جج کو کہ یہ باقاعدہ قانون کے فاضل ہیں اور سند رکھتے ہیں وکالت کی، اور مقدموں میں آتے رہتے ہیں تو ضرورت نہیں، لیکن پہلی مرتبہ کوئی وکیل یا بیرسٹر جائے گا تو یہ اطمینان کیا جائے گا کہ یہ قانون کا طالب علم رہا ہے، اور قانون کی سند اس کے پاس ہے یا نہیں، پھر یہ دیکھا جائے گا۔ کہ موکل نے بھی اس کو اپنا ترجمان بنایا ہے یا نہیں، لیکن دین کا معاملہ عجیب و غریب ہے کہ اس کی حقیقت معلوم کیے بغیر اس کی تاریخ معلوم کیے بغیر، اس کی روح معلوم کیے بغیر ہر شخص اپنا حق سمجھتا ہے کہ اس کے بارے میں مشورہ دے، اور یہاں تک کہ ترمیم اور اصلاح کا مطالبہ کرے، اور اگر اس کو قبول نہیں کیا جاتا تو اس دین کے ماننے والوں پر جمود و جہالت کا الزام لگایا جاتا ہے اور ان کو کم عقل ثابت کیا جاتا ہے۔

میں اصلاً مذہب کا طالب علم ہوں، زیادہ سے زیادہ تاریخ و ادب کا طالب علم ہوں، میں کسی وقت یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ کسی ایسے فن یا مسئلہ میں دخل دوں جس کے مبادی (Fundamentals) سے بھی میں ناواقف ہوں، اگر کوئی شخص سائنس کے مبادی، فزکس کے مبادی یہاں تک کہ ریاضی (Mathematics) کے مبادی سے (جو روزمرہ کی ضرورت ہے) ناواقف ہے تو دنیا کا کوئی پڑھا لکھا انسان اس کو اجازت

نہیں دے سکتا کہ وہ یہ کہے کہ فلاں ماہر ریاضی نے یہ نتیجہ جو نکالا ہے غلط ہے۔ لیکن کیا مذہب ہی ایک ایسی چیز رہ گئی ہے کہ اس کے متعلق جس کا جی چاہے، جس وقت جی چاہے اور جس انداز میں جی چاہے مشورہ دیا جائے، اس کی ترجمانی کی جائے، اور اس میں خامیاں نکالی جائیں اور اس میں ترمیمات پیش کی جائیں، اس سے پورے نظام علم پر اثر پڑے گا، عصر حاضر کا سارا نظام اعتماد و اختصاص (Specialization) پر چل رہا ہے کیا مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے، جس کے ماہرین خصوصی کی کوئی قیمت نہیں؟ پھر مذہب کی ایک زبان ہوتی ہے، مذہب کے اصطلاحات ہوتے ہیں، اس کے الفاظ کے اعماق (گہرائیاں) و آفاق (وسعتیں) ہوتے ہیں، اس کی نفسیات ہوتی ہیں، یہ ساری چیزیں جانے بغیر کوئی شخص بھی (خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو اور کسی گروہ کا آدمی ہو) اگر کہتا ہے کہ صاحب، مسلمانوں کے عائلی قانون کا فلاں مسئلہ غلط ہے تو وہ اپنے حدود سے تجاوز کرتا ہے، وہ پورے سیاق و سباق سے ناواقف ہے اس توازن و تناسب سے ناواقف ہے جس کا لحاظ رکھا گیا ہے، آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر ایک مکمل ڈھانچہ اور جامع ماحول کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو اس کو مجموعی طور پر دیکھنا ہوتا ہے، حالت یہ ہے کہ چوراہے پر کھڑے ہو کر (اور یہ اخبارات بھی ایک طرح کے گھومتے پھرتے چوراہے ہیں) جس کا جی چاہتا ہے قلم اٹھا کر لکھ دیتا ہے، اس سے ایک انارکی پیدا ہوتی ہے، ذہنی انارکی سیاسی انارکی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ ملکوں کی تاریخ میں پولٹیکل انارکی سے پہلے مینٹل انارکی اور اخلاقی انتشار پیدا ہوتا ہے، اسلام کے بارے میں ذمہ دارانہ طور پر عرض کر سکتا ہوں کہ اس کا ایک طالب علم ہوں، فاضل نہیں کہتا لیکن مانا ہوا طالب علم ہوں، اور یہ بال اسی طالب علمی میں سفید ہوئے ہیں کہ دین کے متعلق پہلے اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس کا تعلق وحی الٰہی سے ہے، شریعت آسمانی سے ہے، اس کے لانے والے پیغمبر ہیں، یہودی تک اپنے دین و ملت کے بارے میں غیور واقع ہوئے ہیں، آپ کسی یہودی سے یہ کہہ کر دیکھئے کہ تمہارا یہ مسئلہ غلط ہے، تمہارا یہ قانون غلط ہے، تو وہ کہے گا کہ ہمارے قانون کا تعلق شریعت موسوی سے ہے بائیبل سے ہے، ہم تو اس کے پابند ہیں، ساری دنیا بھی اگر کہے کہ یہ غلط ہے تو ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں، چنانچہ آج بھی اسرائیل کا پورا نظام معاشرت، اور ان کا عائلی قانون اسی پر چل رہا ہے۔

پھر اس مسئلہ پر ملک اور اہل ملک کی توانائی کیوں ضائع کی جا رہی ہے ملک اور اہل ملک کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ غیر ضروری ذہنی انتشار، بدگمانی اور خوف کی فضا ختم کی جائے کوئی ملک اس طرح ترقی نہیں کر سکتا کہ اس کی آبادی کے مختلف عناصر اپنے مستقبل کے بارے میں شکوک و شبہات ہوں، اور اس سے بڑھ کر ملک کے لیے بدخواہی نہیں ہو سکتی کہ وہ

توانائی جو ملک کی سالمیت، اس کی حفاظت اور تعمیر و ترقی میں صرف ہونی چاہیئے تھی، وہ شکوک و شبہات کو رفع کرنے میں یا شکوک و شبہات کی فضا میں زندگی گزارنے میں خرچ ہو، میں ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم اس اندیشہ میں مبتلا ہیں کہ ہماری آئندہ نسل ہماری طرح ان چیزوں کی معتقد اور ان پر یقین کرنے والی نہیں ہوگی جن پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں، اور جو ہمارے لیے ضروری ہیں تو مسلمانوں کے اندر ایک تذبذب اور اندرونی انتشار کی وہ کیفیت پیدا ہوگی جو صرف مسلمانوں کے لیے مضر نہیں ملک کے لیے بھی مضر ہے، یہ ہرگز دانشمندی کی بات نہیں ہے کہ جب ملک میں کوئی مصیبت نہیں آئی، کوئی سائیکلون نہیں ہے، کوئی ایمرجنسی کی کیفیت نہیں ہے، کوئی آسمان سے اولے یا گولے نہیں برس رہے ہیں کسی نے اس لیے حملہ کیا ہے کہ آپ مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کرائیے ورنہ ہم اس ملک پر قبضہ کرتے ہیں، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً یہ آواز بلند ہوتی رہتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی جائے؟

۲۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے اس بارہ میں مذاہب ایسے ہیں کہ وحی و نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انہوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر لیا ہے مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرمانبردار بندہ ہے، اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق بھی ہے، اور وسیع بھی ہے، محدود بھی ہے جامع بھی قرآن شریف میں ہے، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔ (اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔)

یہاں تحفظ نہیں رزرویشن نہیں کہ اتنا آپ کا اتنا ہمارا، اتنا ملک کا، اتنا اسٹیٹ کا، اتنا خدا کا، اور اتنا خاندان اور قبیلہ کا، اتنا دین و ملت کا اور اتنا سیاسی مفادات کا نہیں، جو کچھ ہے سب خدا کا ہے، یہاں سب عبادت ہی عبادت ہے، مسلمان کی پوری زندگی عبادت ہے مسلمان کی پوری زندگی خدا کے سامنے عاجزانہ غلامانہ ہے، اسلام خدا کے سامنے مکمل سپردگی اور اپنے کو surrender بلا شرط حوالہ کرنے کا نام ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت وراثت میں ہمارے اقتصادی حالات کا تقاضہ کچھ اور ہے، یہاں کی مجبوریاں یہاں کے تمدنی تقاضے، معیار زندگی اور ہمارے خاندان کی پچھلی تاریخ، یہ سب اس بات کے متقاضی ہیں، کہ ہم وراثت تقسیم نہ کریں، ہم اس زمین کو اسی طرح باقی رکھیں، کم سے کم لڑکیوں کو حصہ نہ ملے اس لیے کہ شادی کے بعد یہ حصہ ان کے گھروں کو چلا جاتا ہے، اس کا بالکل اختیار نہیں، اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

کہ دین کا دائرہ پوری زندگی پر حاوی ہے، اور اس میں کسی کو بھی ترمیم کرنے کا حق نہیں، بڑی سے بڑی عدالت بڑی سے بڑی قوتِ حاکمہ، اور بڑی سے بڑی ہیئت منتظمہ اور بڑی سے بڑی دانش گاہ اور یہاں تک کہ بڑے سے بڑے مجتہد اور امام وقت کو بھی ان چیزوں میں جو قرآن مجید میں منصوص و قطعی ہیں ایک لفظ، ایک نقطہ کی ترمیم کرنے کی اجازت نہیں ہے، یہ سارے علماء بیٹھے ہوئے ہیں ان کے سامنے کہہ رہا ہوں، اور اگر یہ بات غلط ہے تو ان کا دینی تبحر اور احساسِ فرض انہیں مجبور کرے گا کہ یہ میری تردید کریں۔

ان دو حقیقتوں کو سمجھ لیا جائے کہ ایک تو یہ کہ یہ دین ہمیں وحی سے ملا ہے، پیغمبر کو بھی اس پر عمل کرنیکا حکم ہے، قرآن مجید میں صاف صاف آتا ہے۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (اے پیغمبر!) ہم نے آپ کو دین کے خاص طریقہ (شریعت) پر کر دیا ہے تو آپ اسی پر چلتے جائیے، اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔)

نبیٔ معصوم اور نبیٔ محبوب سے یہ کہا جا رہا ہے تو ہم سے کیسے مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم شریعت کو بدل دیں۔

یہ دو حقیقتیں ہیں جن کو سمجھنے کے بعد اس غلط فہمی کا پردہ ہی چاک ہو جاتا ہے اور ایک غیر ضروری صورت حال کا مقابلہ کرنے اور اس پر اپنی ذہانت صرف کرنے سے ہمیں چھٹی مل جاتی ہے، اور ملک و حکومت کو دوسرے ضروری کاموں کے لیے وقت بچ جاتا ہے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کے لیے، سالمیت کے لیے اور مشترک وطنی شعور کے لیے ضروری ہے کہ ایک مشترک واحد عائلی قانون (Uniform Civil Code) نافذ ہو، تو میں ایک سیدھی سی بات پوچھتا ہوں، اسکول کا بچہ بھی اس کا جواب دے سکتا ہے کہ پہلی جنگِ عظیم جو ہوئی تھی، وہ اصلاً و ابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں، اور ان کا عائلی قانون بالکل ایک ہے، یہ کوئی بھی شخص معلوم کر سکتا ہے کہ جہاں تک عیسائی قانون کا تعلق ہے ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہیئے تھا، پھر دوسری جنگِ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ کرسچین اور پروٹسٹنٹ جن کی تہذیب بھی، عائلی قانون بھی بلکہ معاشرت بھی ایک ہے، وہ اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، آپ عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ لیجئے کہ جو مقدمے آتے ہیں، مسلمان مسلمان کے خلاف مدعی ہے، مسلمان مسلمان کا مدعا علیہ ہے، اور مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی

قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت سے ہے، دولت پرستی کے جنون سے ہے، نفس پرستی اور مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے، جس نے اخلاقیات کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، یہ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق بھی نہیں پڑیگا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیئے تاکہ آپس میں اتحاد و الفت پیدا ہو۔

حضرات! جاننے والے جانتے ہیں کہ میرا اس گروہ اور خاندان سے تعلق ہے جس نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور بیش از بیش حصہ لیا، کلکتہ کی یہ سرزمین خاص طور سے اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ ایمانی قافلہ حجاز جاتے ہوئے یہیں سے گذرا تھا، اسی خلیج بنگال سے روانہ ہوا تھا، اور اپنے مستقر سے یہاں تک ایمان، توحید و سنت اور دینی حمیت کی روشنی پھیلاتا ہوا آیا تھا[1]، اسی نے سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی روح پھونک دی[2]، قرآن کہتا ہے کہ تمہیں عصبیت اور بغض اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے دو، اور تعصب و حق پوشی سے کام لو۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ[3] (اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے۔)

انگریز اس بارہ میں زیادہ حقیقت پسند تھے، انہوں نے جب ہندوستان میں حاکمانہ طریقہ پر قدم رکھا تو انہوں نے اچھی طرح یہ سمجھ لیا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے عائلی قانون میں دخل نہیں دینا چاہیئے، ان کو اس میں آزاد رکھنا چاہیئے۔ اسی کے نتیجہ میں ہندوستان میں محمڈن لا کا اتنا بڑا کام ہوا، اسی کلکتہ کی سرزمین پر اور خاص طور پر بادش نجیر رائٹ آنریبل جسٹس سید امیر علی کے ہاتھوں اور سر عبدالرحیم وغیرہ کے ذریعہ ہوا، انگریزوں نے دو کام بڑی عقلمندی کے کیے، انہوں نے اس بات کو پالیا کہ بے ضرورت جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہیئے اور مشکلات نہیں پیدا کرنے چاہئیں، یہ ایک ایسی قوم کا طرز عمل ہوتا ہے جو حکمرانی کا تجربہ رکھتی ہے، انہوں نے دو باتیں طے کیں، ایک تو یہ کہ عائلی قانون اور مذہب میں مداخلت نہیں ہونی چاہیئے، دوسری بات یہ کہ نظام تعلیم سیکولر ہونا چاہیئے کہ بلی کتے کے قصے پڑھاؤ مگر کسی دوسرے مذہب کی تلقین نہ کرو، ہم نے انگلش پرائمر اور ریڈریں پڑھی تھیں، ان میں شروع سے اخیر تک یہ دیکھا کہ جنوں اور بھوتوں پریوں تک کے قصے اور

افسانے آئے، جانوروں کے قصّے آئے لیکن کہیں یونانی رومن دیومالا (Mythology کی بات کہ جسے میتھالوجی کی بات نہیں آئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اطمینان کی کیفیت رہی، وہ بنیادیں دوسری تھیں جن بنیادوں پر ہندوستان کے مسلمانوں نے اور دوسرے عناصر نے مل کر یہاں غلامی کا جوا اپنے سر سے اتار کر پھینک دیا اور جنگِ آزادی لڑی، ان دونوں دانشمندانہ فیصلوں نے ان کی حکومت کی بقاء میں مدد کی اور اس کی مدت کو دراز کیا، ورنہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اپنے تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ جو واقعہ ۱۸۵۷ء میں پیش آیا وہ ۱۸۰۰ء میں پیش آسکتا تھا، اور پیش آنا چاہیئے تھا، اور انیسویں صدی کے بالکل اوائل میں پیش آجانا چاہیئے تھا، یہ سو برس سے زائد جو انہوں نے یہاں اطمینان سے حکومت کی، اس میں ان کی اس دانشمندی کو دخل ہے کہ باشندگانِ ملک کی مذہبیات میں ان کے عائلی قانون میں دخل نہ دو، ان کے نظامِ تعلیم میں دخل نہ دو، ان کو سکولر طریقہ پر پڑھاؤ، اپنے اپنے مذہب کے مطابق یہ عقیدہ رکھیں، عمل کریں۔

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اور اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظامِ معاشرت وتہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر موثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسجد میں آپ مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہنا ہے اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اس لیے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظامِ معاشرت نظامِ تمدن، اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے، جیسے دعوتِ ارتداد کا مقابلہ کیا جانا چاہیئے، اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقاء اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہارِ خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون و اطمینان میں مضمر ہے۔

آخر میں آپ کے اس اعتماد و اعزاز کا نیز آپ کی توجہ و التفات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس کا آپ نے مجھے اپنے خیالات کے بے لوث و آزاد طریقہ پر پیش کرنے کی اجازت دے کر اظہار فرمایا وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین ۝

بشکریہ :- تعمیرِ حیات لکھنو

ہر دانہ منتخب
فریش ویل
بادام اور پستہ
نئے دھوئے - تازہ
مصالحے دار - ذائقے دار
نمکینیت کے نئے پہلو اور
بھرپور ذائقے کے ساتھ
Freshwell
Freshwell
ناشتے پر
چائے پر یا کسی بھی وقت
لذت میں ایک خوشگوار اضافہ
جدید ترین نائٹروجن پلانٹ پر
پیک کیے جاتے ہیں۔
سیل بند ڈبے کو کھولنے کا سہل ترین
طریقہ پاکستان میں پہلی بار
ہم نے متعارف کرایا۔
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ

MASS

قسط ۳

دِل افگندیم
بسم اللہ مجرہا و مرسٰھا

مولانا سعید الرحمٰن علوی

ان دو طبقات کے علاوہ بعض دوسرے طبقات!!

ان دو طبقات کے علاوہ ایک طبقہ ان رجالِ کار اور اعاظمِ امت کا ہے جنہوں نے ہر نئے فتنے کے سامنے بند باندھا۔ امت کی تاریخ میں قدریت، جبریت، تجسیمیت، جہمیت، اعتزال، خلقِ قرآن، رفض، باطنیت، خارجیت اور دینِ الٰہی وغیرہ کے نام سے جو طوفان اٹھے، اللہ تعالیٰ نے ان کا مقابلہ کرنے اور ان کا رُخ موڑنے اور امت کو ان کے مسموم اثرات سے بچانے کی غرض سے امام اعظم ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل سے لے کر حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم وما بعد تک جن شخصیات سے کام لیا، انہیں کون سے پردے میں چھپایا جائے گا، اگر امام اہلِ سنت اور فقہ کے ایک دبستان کے امام" احمد بن حنبلؒ نہ ہوتے تو فتنہ خلقِ قرآن کا عالمِ اسباب میں کیا بنتا! اور برِ عظیم میں فسادِ ذہنیت کا شکار علماء و مشائخ کے سبب جو گمراہی دینی حوالہ سے پھیلی اس کے سامنے روک بننے والے مجددِ سرہندی کا مقام کتنا عظیم ہے؟

ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی اَلَم نَشرَح ہے کہ قرآن و سنت کے "تزکیہ و احسان" کی صفات کی غرض سے مصلحین کا ایک طبقہ ہر دور میں موجود رہا جن کا ورثہ "علمِ تصوف" کے نام سے معروف ہے، یہ حضرات تاریخِ اسلام کی زندہ اور متحرک شخصیات ہیں، جن کے سوزِ دروں نے امت کے عام لوگوں کو روحانی اور مہلک امراض سے بچانے کی سعی و جد و جہد کی۔ تصوف سے اس لئے الرجک ہونا کہ ایسی بات یونان و ہندوستان میں بھی تھی یا یہ کہ تصوف کے نام پہ بعض حضرات کا رویہ صحیح نہیں، عجیب سی بات ہے، سلوک و تصوف ایک حقیقت ہے۔ کوئی شخص اپنے بُرے مقاصد کے لئے اس کا نام لیتا ہے تو وہ گردن زدنی ہے نہ کہ تصوف وصوفیاء و مشائخ! مولانا ابو الحسن علی میاں مدظلہ نے ان جملہ طبقات کی خدمات اور قربانیوں کا تفصیل

سے تذکرہ کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہی لوگ گلشنِ اسلام کے وہ سدا بہار پھول ہیں جن کی رنگینی وخوشبو سے اب بھی مشامِ جاں معطر ہے اور گوشہ چمن مہک رہا ہے۔

الف ثانی کی تجدید اور برِ عظیم پاک وہند

ان اوراق میں تفصیل بڑی مشکل ہے، ہم اپنا رُخ گیارہویں صدی کیطرف موڑتے ہیں، جب "الف ثانی" کی تجدید کا سہرا ایک ہندی نژاد کے سر بندھا، مشرقی پنجاب کے خطہ سرہند سے اٹھنے والی ایک عبقری شخصیت اس خطہ میں "بابِ تجدید" کے وا ہونے کا سبب بنی اور پھر قدرت کی نیرنگیاں ہیں یہ سلسلہ اب تک مرکزیت کے اعتبار سے اسی خطہ میں گھوم رہا ہے۔ سقوط بغداد کے بعد عالمگیر نوعیت کی دوسری شکل اسی صدی میں پیش آئی اور اسی سے وہ عظیم الشان انسان اٹھا جس نے صدی کا نہیں الف ثانی کا مجدد بن کر دنیا کو ظلمات سے بچایا۔ ہمایوں کے ساتھ تعاون کے نام پر جو فتنہ ایران سے نکل کر پورے ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لینے کی فکر میں تھا اور جس کے اثرات آگے تک پھیلنے کا اندیشہ تھا اس بند باندھا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے۔ اور اسی پر بس نہیں بلکہ آئندہ چل کر نصرانیت کی شکل میں جو طوفان اٹھنے والا تھا، جس کا ایک مشاہدہ "اکبر" کے جشنِ نوروز میں فرنگیوں کی آمد سے ہو چکا تھا۔ اس کا ذکر اپنے مکتوبات میں "کافر فرنگ" کے عنوان سے کرنا خداداد بصیرت کا شاہکار ہے۔

حضرت الامام مجدد الف ثانیؒ

یہ خطہ مصدقہ تاریخی روایات کے مطابق دورِ صحابہ میں ہی اسلام کی نورانیت سے کسی درجہ میں منور ہو چکا تھا اور حضرت الامام مجدد سے قبل بھی یہاں کے محدثین وفقہاء اور ارباب دعوت کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن نظریاتی فتنوں کے خلاف بند باندھنے کی جس طرح کی ہمت آپ کو ہوئی اور حکومت کا رُخ جسطرح آپ نے بدلنے کا انداز اختیار فرمایا وہ آپ کا ہی کا حصہ ہے۔ ادھر آپ ہی کے برادر حضرت الشیخ عبدالحق محدث دہلوی نے سرمایۂ حدیث کی اشاعت وتدریس کا اسی دور میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ کر اہتمام کیا۔

ان حضرات کی سعی وکاوش سے حالات روبہ اصلاح ہوئے، ملک میں امن کی کیفیت پیدا ہوئی، زندگی کے تغیر پذیر تقاضوں کے سبب فقہ اسلامی کی تدوین نو کا کام ہوا اور بہت سی برکات ظہور پذیر ہوئیں ـــــ مغلیہ خاندان کے ایک اہم فرماں روا غازی اورنگزیب عالمگیر مرحوم کی وفات سے ۴ سال قبل حضرت شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوئے جو بقول مولانا عبید اللہ

سندھی علیہ الرحمہ حضرت مجدد الف ثانی کے کام کے آگے بڑھانے والے اور ان کے مشن کی تکمیل کرنے والے تھے۔

ذکر مولانا سندھیؒ کا تاریخ کی بہت سی مظلوم شخصیات کے دائرہ میں مولانا سندھی کا نام بھی آتا ہے جنہوں نے سکھ مت چھوڑ کر اسلام قبول کیا، پھر چونڈی امروٹ (سندھ) اور دین پور (بہاولپور) کی خانقاہوں سے علم و عرفان کے موتی لوٹتے دیوبند پہنچے، گذشتہ صدی کے مجدد اکبر شیخ الہند مولانا محمود حسن کی حسن تربیت نے اس شخص کو قرآن کے علوم و معارف کا ماہر بنا دیا ادھر بارہویں صدی کے مجدد کبیر امام ولی اللہ کی حکمت انقلاب و فکر کا کاسب سے بڑا ادائی اور شارح۔ یہ شخص جس کی رگوں میں خون نہیں آگ دوڑتی تھی ملکوں ملکوں پھرا۔ اور بیسویں صدی کے انقلاب روس کے علمبرداروں کے دروازہ تک پہنچ کر انہیں اسلام کے پیغام حیات سے آگاہ کیا لیکن افسوس کہ اس کی درس گاہ کے بعض عزیزوں سے لے کر ندوہ اور جماعت اسلامی تک نے اسے معتوب قرار دیا اور مولانا مسعود عالم ندوی نے (جو ندوہ و جماعت کے بیک وقت خوشہ چیں تھے) تو ایسی ظالمانہ تنقید کی کہ الاماں۔ موصوف تنقید میں اسلام کے اصول عدل و اعتدال تک کی رعایت نہ رکھ سکے۔ اس تنقید کا مؤثر علمی اور شافی جواب مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ نے دیا ـــــ مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سندھی کو (دیکھیں "الفرقان" شاہ ولی اللہؒ نمبر) شاہ ولی اللہؒ کا سب سے بڑا شارح اور رازداں کہتے ہیں، اور مولانا سندھی کی رائے یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کا کام وہی ہے جو مجدد الف ثانی کا تھا، وہی مشن، وہی فکر وہی سوچ۔

امام ولی اللہ دھلوی کا مجددانہ رول امام ولی اللہ نے سیاسی انقلاب کی کوششیں کیں جس کا ثبوت "خلیق احمد نظامی" کے مرتب کردہ "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" سے ملتا ہے۔ یہ ذخیرہ نظامی صاحب کو دار العلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری کے کتب خانہ سے فراہم ہوا۔ احمد شاہ ابدالی اور نواب نجیب الدولہ سے ربط و ضبط سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب یہ محسوس کر گئے تھے کہ کوئی انقلاب اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کی پشت پر مخلص اور بے لوث رضاکاروں کی فوج نہ ہو۔ مروجہ اصطلاح میں کوئی باقاعدہ فوج کتنی ہی متمدن اور چاق و چوبند ہو وہ کامیاب نہیں قرار پا سکتی۔ کامیاب وہی فوج ہوتی ہے

جو رضا کارانہ بنیاد پر منظم ہو اور جس کی اپنی فکری تطہیر ہو چکی ہو۔

ولی اللّٰہی فکر پر انقلابی جماعت کی تشکیل!!

یہی وجہ ہے کہ آئندہ چل کر شاہ صاحب کے فکر پر جو کام ہوا اس میں ایسی ہی فوج کا اہتمام کیا گیا۔ (امام ولی اللہ دہلوی کی تعلیمات ان کی تحریک اور ان کے افکار کو سمجھنے کیلئے "الفرقان" کے شاہ ولی اللہؒ نمبر کا مطالعہ مفید ہوگا' ادھر مولانا سندھی کی کتابیں تو اس سلسلہ میں کلیدی اہمیت کی حامل ہیں بالخصوص شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک اور محمودیہ) حضرت مجدد الف ثانی کے خدام و اہل تعلق نے وسطی ایشیا کی ریاستوں سے لے کر شام تک میں تجدیدی مساعی کا فرض سرانجام دیا تو امام ولی اللہ کے روابط حرمین شریفین تک نظر آتے ہیں' حرمین کے اساتذہ کا یہ کہنا کہ یہ شخص ہم سے الفاظ لیتا ہے لیکن ہمیں مفہوم و معانی سے آگاہ کرتا ہے" جہاں شاہ صاحب کی بصیرت علمی و روحانی کی دلیل ہے وہاں اس کے پس منظر اور تہہ منظر میں اور بہت کچھ نظر آتا ہے اور کیا عجب کہ اس خطہ میں آئندہ جو انقلاب آیا اس کی تہہ میں بالکلیہ نہیں تو کسی درجہ میں ولی اللّٰہی افکار کی بوتحقیق کے بعد کوئی محسوس کرلے ——— یہ بات کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب یا اس کے متعلقین میں سے کسی نے اس کا اشارہ نہیں کیا' بے وزن سی بات ہے، ضرورت ہے کہ تاریخ کے اس دلچسپ معاملہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

شاہ ولی اللہؒ اور شیعہ

خود برِ صغیر کا معاملہ ایسا تھا کہ اس میں اندرونی انتشار جو بن پر تھا۔ ایرانی عمائدین جو پوری طرح چھا چکے تھے ان کی خفیہ ریشہ دوانیاں رنگ لا رہی تھیں اور وہ لوگ تاج و تخت ہی کے مالک بن کر نہ بیٹھ گئے تھے بلکہ انہوں نے نظریاتی بنیادوں کو ڈھانا شروع کر دیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے "ازالۃ الخفاء" اگر لکھی اور پھر "قرۃ العینین" لکھی تو بلاوجہ نہیں اور ان کے فرزندِ گرامی شاہ عبدالعزیزؒ نے "تحفہ اثنا عشریہ" لکھی تو بھی اس غرض سے کہ ایک ایسا فتنہ جو اس خطہ کا نہیں ساری دنیا کا عظیم فتنہ ہے' اس کا سدِّ باب ہو سکے۔ اے کاش کہ اس دور کے اہلسنت اور مابعد کے مقتدایانِ فکرِ ولی اللّٰہی اس ایرانی فتنہ کا تدارک کر سکتے تو آج یہ حال نہ ہوتا ——— "تفہیماتِ الٰہیہ" کا ایک مقام ملاحظہ فرمائیں جہاں امام ولی اللہؒ روحِ محمدی علیہ السلام سے استفادہ کرتے ہوئے بہت سی حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں حتیٰ کہ شاہ صاحب بول اٹھتے ہیں:

در حقیقت ختم نبوت را منکر اند گو بزبان آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم را
خاتم الانبیاء میگفتہ باشند صـ ۲۴۴

شاہ ولی اللہؒ کی فکر میں مسئلہ معاش کے حل کے لئے کاوشیں

ادھر شاہ صاحب کی بصیرت اور فراست مومنانہ انقلابِ روس کے فکری بانیوں کی پیدائش سے بھی بہت قبل ان مسائل کی طرف حقیقت پسندانہ توجہ دلانے کی سعی کرتی نظر آتی ہے جن کا تعلق اسلام کے عدل اجتماعی کے حصہ معاشیات سے ہے۔ کوئی حجۃ اللہ البالغہ کے " ابتغاءِ رزق کے ابواب ملاحظہ کرے اور پھر سوچے کہ رزق کی مساوی تقسیم اور اس معاملہ میں اسلام کے عادلانہ فکر کی اس سے اچھی تعبیر ممکن ہے! مولانا مناظر احسن گیلانی سے لے کر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی تک اور اب زندہ حضرات میں سے مولانا محمد تقی امینی سے لے کر مولانا طاسین تک، یہ حضرات اسی فکر کے علمبردار ہیں جو تجارت وزراعت وغیرہ کے معاملات میں قوم کو سنجیدہ انداز اپنانے کی توجہ دلا رہے ہیں۔ اس پورے خطہ کا المیہ یہ ہے کہ یہاں کمیونزم کا ہوا تو ہر کوئی دکھاتا ہے لیکن اس " فتنہ عمیا " کو روکا کیسے جائے، اس کی طرف توجہ کسی کی نہیں ہوتی۔ اگر حفظ الرحمٰن جیسا کوئی شخص قلم اٹھاتا ہے تو اس پر کمیونسٹ ہونے کی پھبتی کسی جاتی ہے اور عبید اللہ سندھی کے ایمان تک کو معرضِ خطر میں لا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ مسئلہ اسی طرح حل ہوگا جس طرح سیدنا ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا کہ روزینہ تو ہر شخص کو برابر ملے گا، اس میں کسی چھوٹے بڑے کی تمیز نہ ہوگی، رہ گیا معاملہ کسی کے سابق فی الاسلام ہونے کا یا اس کی خدماتِ اسلامی کا تو اس بنیاد پر وہ الّلے تلّلوں کا مستحق نہیں، اس کا صلہ واجبہ رب العزت کی بارگاہ سے ملے گا۔

امام ولی اللہؒ نے اسی صدیقی فیصلہ کو بنیاد بنا کر یہ ابواب قلم بند کئے اور انہی بنیادوں پر شاہ صاحب کے فرزندانِ روحانی نے عمارت استوار کرنے کی فکر کی ـــــ اے کاش وہ اہلِ سیاست جو اس خانوادہ کا نام لیتے ہیں، وہ ہی کم از کم اس کی فکر کرتے؟

مغرب سے اٹھنے والا فتنہ جبر اور ـــــ شاہ ولی اللہؒ

شاہ صاحب نے " الفوز الکبیر " میں اصول تفسیر بیان کرتے ہوئے اہل کتاب کے ساتھ محاکمہ کی جو گفتگو کی، کیا وہ محض نظریاتی بحثیں ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ اس شخص نے شاہ ولی اللہؒ کو سمجھا ہی نہیں، وہ محض اندھیروں میں

بھٹک رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے اور ہم اس پر بوقت ضرورت تفصیل سے گفتگو کر سکتے ہیں کہ اگر مشرقی فتنہ کا سر کچلنے کے لئے (جو معاش کے حوالے سے آنے والا تھا) حجۃ اللہ البالغہ کی معاشی پالیسی کارگر ہو سکتی ہے تو مغرب کی طرف سے آنے والا فتنہ (بصورت غلبہ و استیلاء سیاسی) الفوز الکبیر کی ان ابحاث کی روشنی میں کچلا جا سکتا ہے۔ گویا مشرقی، مغربی اور اندرونی تینوں ہی فتنوں کی نشاندہی اور ان کے سدباب کا اس رجل رشید نے سامان فراہم کیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی نگرانی میں حضرت سید صاحب کی تیاری

اسی سروسامان کی روشنی میں شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے مرکزی قوت کا رول ادا کر کے "فک کل نظام" کی عملی شکل کی غرض سے تحریک جہاد و مجاہدین کی داغ بیل ڈالی اور اس کے لئے "طالوت" کا کردار ادا کرنے کی غرض سے رائے بریلی کے ایک باہمت، جفاکش اور مردِ حُر "سید احمد" کو چنا جسے امام کبیر، مجاہد اعظم اور امیر المؤمنین کا نام و لقب دیا جاتا ہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ "ہندوستان دار الحرب"، کو فوز الکبیر کی روشنی میں سمجھا جائے اور پھر اگلی تحریک کو غور سے پڑھا جائے۔ مولانا غلام رسول مہر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر قیام الدین پٹنہ اور مولانا سید محمد میاں کی کتابیں سید صاحب کی اس پوری تحریک کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔ کس طرح رضاکارانہ بنیادوں پر قافلہ ترتیب پاتا ہے اپنی روحوں کی بالیدگی کی غرض سے کس بے سروسامانی کے عالم میں حرمین شریفین حاضری دی جاتی ہے اور خود ہندوستان کے مرکزی حصوں میں کس طرح دورے کئے جاتے ہیں ــــــ

شاہ عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلے اپنے خاندان کے ذمہ دار افراد کو جو علم و عمر میں سید صاحب سے کہیں بڑھ کر تھے سید صاحب کے دامن سے وابستہ کیا۔ شیخ الاسلام مولانا عبدالحی بڈھانوی اور امام المجاہدین حضرت السید محمد اسمٰعیل شہید حنفی (محض علمی مطالعہ کے طور پر ملاحظہ کر لیں کشف الحجاب ص۲۴ از قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پت "کان سنیا حنفیاً" نیز الحطہ از سید نواب صدیق حسن والیٔ بھوپال کا ص۲ "اقتضٰی اثر جدہ فی قولہ وفعلہ جمیعاً" (ہر قول و فعل میں اپنے دادا کی پیروی کی) نیز تنبیہ الضالین ص۸۷-۸۸ مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے استاذِ محترم مولانا عبدالخالق کا ارشاد کہ تنویر العینین ان کی شہادت کے بعد ان سے منسوب کر دی گئی ...... الخ ھکذا فی "حیاتِ طیبہ" ص۲۶۶ از مرزا حیرت دہلوی) اس کی سب سے بڑی شہادتیں ہیں ــــ سید صاحب

نے بھرپور تیاری کے بعد راجستھان، سندھ اور کہاں کہاں کے مشکل سفر طے کر کے سرحدی علاقوں کو اپنا مرکز بنایا اور پشاور سے عملی جہاد کا آغاز کیا ـــــ مرحوم سید سلیمان ندوی نے مولانا علی میاں کی کتاب سید احمد شہید کے مقدمہ میں جس دردِ دل سے ایک فقرہ لکھا ہے اس کی گرمی آج بھی محسوس ہوتی ہے، فرمایا:

"اگر خوانینِ پشاور وسمہ وفاداری کا مظاہرہ کرتے تو نقشہ ہی دوسرا ہوتا"

حضرت سید احمد شہید کی محنت کے اثرات ـــــ!!

لیکن افسوس کہ بیگانوں سے بڑھ کر اپنوں کی بیوفائیاں سدِ راہ بنیں ـــــ اذا ھبت ریح الایمان" مولانا علی میاں کی عربی کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ "جب ایمان کی بہار آئی" کے نام سے چھپ چکا ہے، اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ برِ عظیم کے مرکزی علاقوں بہار، بنگال، یوپی وغیرہ میں کس طرح ایک انقلاب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے اکابر مشائخ شاہ عبدالرحیم سہارنپوری اور حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی سے لے کر علماء صادق پور جیسے اساطین علم و امارت تک سید صاحب کے دامن سے وابستہ تن من دھن قربان کرنے پر آمادہ ہیں ـــــ لیکن افسوس کہ جس علاقہ کو مرکز بنایا گیا اس کے اساطینِ حکومت و امارت جھوٹی اور وقتی خوشیوں کے لئے ان مردانِ حر کے سدِ راہ بنے، پشاور میں ایک ہی رات میں سید صاحب کے سینکڑوں قیمتی رفقاء کے قتل سے لے کر سید صاحب کو زہر دینے تک اور پھر مشہد بالاکوٹ تک ایک ایک منزل ان ستم کیش لوگوں کی بیوفائیوں کا پتہ دے رہی ہے ـــــ تاہم سید صاحب نے جو مشعل جلائی، علماء صادق پور اور دوسرے حضرات نے اسے برابر روشن رکھا۔ چرقند کا مرکز انہی بلانوشانِ محبت کی آماجگاہ تھا۔ ادھر بہار و حیدرآباد دکن اور پھر بنگال میں فرائضی تحریک اور مختلف حوالوں سے وہی روشنی کام آرہی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں سید صاحب کی تحریک سے بڑھ کر ایمان و یقین پیدا کرنے اور دینِ اسلام کے غلبہ کی کوئی تحریک نہیں ابھری اور اپنے معصوم بچپن کے دور میں وقت کے ایک عظیم روحانی قائد و پیشوا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ (جن کی خدماتِ ملیہ کی ایک طویل داستان ہے) کی زبان سے اس سلسلہ میں جو لفظ سنے اور حضرت کے خدام حضرت السید نفیس شاہ صاحب اور حاجی متین احمد صاحب (حضرت کے میزبان) سے پھر اس کی تصدیق کی ـــــ تو دل کو دھچکا لگا۔ اور دنیا دور و اندھیرے کا شکار نظر آئی ـــــ امام وقت شاہ عبدالقادر نے فرمایا کہ سید صاحب

کی اس عظیم الشان جدّ وجہد کا جو حال ہوا، اسے دیکھ کر تو اب طبیعت سرد ہی ہو کر رہ گئی ہے۔ کہاں کو ایسے دیوانے اٹھیں گے جو اس طرح "لَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلَ مُسْلِمًا" کا رجز خباب" رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑھ کر حالات کے دیوِ استبداد و جبر سے ٹکرا جائیں گے ـــــ تاہم مایوسی نہیں : لعلّ اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

سیّد صاحب کے بعد کے اہم اقدامی مراحل!!!

مسلح انقلاب کی جو جد وجہد حضرت سیّد صاحب نے شروع کی اور اصلاحِ احوال کا جو مشن جس نہج سے انہوں نے اٹھایا، اس کی آئندہ ایک بھرپور کوشش ۱۸۵۷ء کا جہادِ آزادی ہے جس میں قیادت کرنے والے اکثر و بیشتر حضرات وہی تھے جنہیں قافلۂ سیّد کے باقیات کہنا چاہیئے "۱۸۵۷ء کے ہیرو" نامی کتاب میں سیدہ انیس فاطمہ نے اور بعض دوسرے حضرات نے اس موضوع پر تفصیلی کلام کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں جس "جذبۂ حریت" کو سرد کرنے کی کوشش کی گئی تھی وہ سرد نہ ہوا۔ بلکہ خاکستر میں چنگاری کی شکل اختیار کر گیا اور مختلف مواقع پر بھڑکا جس کی ایک مؤثر شکل ۱۸۵۷ء میں سامنے آئی۔ اسی دور کا جہاد شاملی ہے جس کی قیادت سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی نے کی جو ۴ سال کی عمر میں حضرت سیّد صاحب قدس سرّہٗ کی گود میں دیئے گئے جب انہوں نے ان نواح کا دورہ کیا تھا۔ سیّد صاحب نے اس بچہ کو گود میں لے کر پیار اور دعا کی ـــــ لطیفہ یہ ہے کہ سیّد صاحب اور حاجی صاحب دونوں ہی کا معاملہ ظاہری علم کے طور پر بس واجبی تھا۔ لیکن ان کے دامنِ فیض سے وابستہ ہونے والے اعاظم رجال و اکابر علماء تھے، سید صاحب کے سلسلہ میں مولانا عبدالحی مولانا شاہ اسمٰعیل اور علماء صادق پور کے نام کافی ہیں تو حاجی صاحب کے وابستگان میں قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی، فقیہ عصر مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور بعض واسطوں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا سیّد حسین احمد مدنی جیسے اساطین علم شامل ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور آپ کے خاندان کا جب علمی عروج تھا تو رائے بریلی میں شاہ علم اللہ کا خاندان تھا۔ اُدھر خود دہلی میں نقشبندی مجدّدی حضرات معروفِ خدمتِ علم و معرفت تھے اور لطف یہ کہ سب حضرات کا باہمی گہرا رابطہ اور تعلق تھا۔

شاہ عبدالعزیز کو خاص طور پر جو علمی عروج نصیب ہوا اور ان کے فیض یافتگان اس وسیع خطّہ میں پھیلے اس کی مثال تاریخ میں خال خال ملتی ہے ـــــ اس خاندان نے جو رجالِ علم تیار

سکے وہ تو کئے ساتھ ہی ترجمۂ قرآن اور درسِ حدیث، نیز فقہی مسائل میں توسع ووسعت کا ایک رویہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں قرآنی علوم کا چار سو ڈنکا پھیلا جس کا نہایت خوبصورت تذکرہ فاضلِ جلیل مولانا اخلاق حسین قاسمی کی کتاب "محاسنِ موضحِ قرآن" میں ہے ـــــ رہ گیا سلسلۂ تدریسِ حدیث تو اس وقت ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش کی کوئی علمی درسگاہ نہیں جس کی سند شاہ صاحب تک نہ پہنچتی ہو اور شاہ صاحب کے علوم کی اجتماعی وارث تحریکِ علمی دار العلوم دیوبند کے حوالہ سے اس سند کا چرچا اقصائے عالم میں سنائی دیتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد رجالِ دین کی نئی منصوبہ بندی!

۱۸۵۷ء کا موڑ امّتِ مسلمہ بالخصوص اسلامیانِ برِعظیم کے لئے بڑا ہی الم ناک تھا ـــــ گویا سقوطِ بغداد کی دوسری شکل تھی اور بارِ دگر وہی چھٹی صدی والا حادثہ رونما ہوا تھا۔ مغرب کے سیلاب جیسے معلوم ہوتا تھا عالمِ اسلام کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کر رہ گئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کو ایک دوسرے رنگ میں کھڑا کر دیا اور میدانِ کارزار میں بوجوہ ناکامی کا شکار ہونے والے مجاہدین نئی قسم کی منصوبہ بندی سے سامنے آئے۔

اس حقیقت کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس مرحلہ پر دو تعلیمی تحریکیں ابھریں، ایک دیوبند سے، دوسری علی گڑھ سے! گو کہ اس وقت بعض اور تعلیمی تحریکیں بھی تھیں جیسے خیرآباد، فرنگی محل وغیرہ لیکن جو جامعیت مدرسہ رحیمیہ دہلی (مدرسہ شاہ ولی اللہ) میں تھی وہ ان تحاریک میں نہ تھی، بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ابھرنے والی دو تحریکوں دیوبند ـــــ علیگڑھ میں سے بھی، مدرسہ رحیمیہ کا عکسِ جمیل نظر آتا ہے تو محض دیوبند کی تحریک میں۔

ہر چند کہ دیوبند اور علیگڑھ کی تحاریک کے بانی مولانا محمد قاسم اور سرسید احمد خاں دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے جو سلسلہ ولی اللّٰہیہ کے عظیم فرزند تھے لیکن سرسید احمد خاں مرحوم نے ایک اہلِ علم کے بقول "اعتزال" کا راستہ اختیار کیا اور جو عطارِ ملت کی بربادی کا باعث بنا تھا اسی کے لونڈے سے علاج کرانے میں عافیت سمجھی۔

تاریخی تسلسل کے حوالہ سے لامحالہ دیوبند کا نام لینا پڑتا ہے جس نے علمی تحریک کے حوالہ سے جہاں علمی وراثت و روحانی اقدار کی حفاظت کا کام کیا وہاں ملت کی خوشحالی و آزادی کے کام اور مشن سے بھی وہ برابر متعلق رہا۔

شیخ الہندؒ ـــــ ہمہ گیر اور جامع شخصیت

دارالعلوم دیوبند، جو اس تحریک کا ابتدائی مدرسہ تھا، اس کے پہلے طالبعلم مولانا محمود حسن تھے جنہیں بعد میں "شیخ الہند" کے نام سے پورے برعظیم نے یاد کیا اور پھر میرے استادِ گرامی مولانا مفتی محمد شفیع سرگودھوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول یہ "الہامی لقب وخطاب" حضرت والا کے نام کا جزو لاینفک ہی نہیں، اصل پہ غالب آیا، یہ دراصل ان کی عظیم دینی وملی خدمات کا دنیا کی طرف سے اعتراف تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرفِ قبولیت کی سند۔

ایک مرحلہ پہ مدرسہ میں "سیاسی سرگرمیوں" کے ضمن میں جب بعض حضرات نے دبی زبان میں کچھ باتیں کیں تو شیخ الہند نے فرمایا کہ بھائی مدرسہ تو ہمارے سامنے بنا۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت الاستاذ (مولانا نانوتوی) نے کیوں بنایا اور اس کے مقاصد کیا تھا؟

اور انہی شیخ الہندؒ نے ایک نازک موقع پہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جوان کی غرض سے مدرسہ نہ جاکر (جس کی تفصیل مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے حوالہ سے میثاق میں آچکی ہے) اسی حقیقت اور امرِ واقعہ ہی کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مدرسہ محض تعلیم وتعلّم کے لئے نہیں بنا، اس کے اصل مقاصد کچھ اور ہیں ـــــ پھر اس نقطۂ نظر سے بھی ذرا غور فرمائیں کہ مختلف مواقع پہ اس مدرسہ اور اس تحریکِ ملی کے علمبرداروں نے جس غیرتِ ملی کا مظاہرہ کیا اس کا ثبوت کہیں اور ملتا ہے؛ جنگ طرابلس ہو یا بلقان، دوسری جنگ عظیم کے دوران خلافت عثمانیہ کی بقا کا مسئلہ ہو یا ندوہ وجامعہ ملیہ کا قیام، حتیٰ کہ علیگڑھ کی بقا کا سوال جب آیا، تو ان حضرات نے آگے بڑھ کر اپنا ملی فرض ادا کیا۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کا عرصہ ـــــ!!

دنیا جانتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کا حادثہ امتِ مسلمہ کے لئے کتنا سنگین تھا، ایسے حادثات کے بعد قوموں کے سنبھلنے میں بڑا وقت خرچ ہو جاتا ہے۔ آخر بستی بسانا کھیل تو نہیں یہ تو بستے بستے بستی ہے، یہی وجہ ہے کہ برعظیم ہند وپاک میں ۱۹۰۰ء تک کوئی منظم تحریک یا اقدام کی شکل نظر نہیں آتی۔ ہاں اس دور میں نظر آتا ہے تو یہ کہ وہ قائدینِ ملت جو جنگ کی بازی ہار گئے تھے تعلیم کے حوالہ سے اپنے آپ کو منظم کر رہے ہیں۔ اسی دور میں سرسید احمد خانؒ بھی اپنا کام شروع کیا۔ اسی زمانہ میں انگریز کے مخصوص اشارہ سے قادیانی نبوت کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے مقاصد بڑے واضح تھے۔ اسی زمانہ میں ایک مخصوص حوالہ سے "کانگریس" کی تشکیل ہوئی اور پھر بیسویں صدی

کے پہلے دہے میں "شملہ وفد" کے نتیجہ میں مسلم لیگ کا قیام معرض وجود میں آیا۔ تحریک دیوبند کے حضرات نے چونکہ اب کچھ قوت مجتمع کر لی تھی اس لئے انہوں نے علمی اجتماعات اور جلسوں کے ذریعہ رائے عامہ کی بیداری کا کام شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے پیچھے اصل ہاتھ مولانا محمود حسن کا ہی تھا جو جہاد شاملی کے قائدین مولانا نانوتوی و مولانا گنگوہی کے علمی تربیت یافتہ ہی نہیں بلکہ روحانی تربیت یافتہ بھی تھے۔ اور ان کے جذبۂ جہاد و حریت کے وارث بھی! ان اجتماعات کے لئے ایک علمی انداز کی مجلس قائم کی گئی جس کے ناظم مولانا عبیداللہ سندھی تھے اس کے دو اہم اجتماع کانپور اور مراد آباد میں ہوئے جن میں اس دور میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی بھی شریک ہوئے۔ اور انہوں نے ناظم اجتماع مولانا عبیداللہ سندھی کی بے حد تعریف کی۔ ساتھ ہی خود دیوبند میں ۱۹۱۰ میں مولانا محمود حسن نے جلسہ دستار بندی کا اہتمام کرایا لیکن اس میں جہاں اپنے حلقہ و طبقہ کی اجتماعی قوت کا اندازہ لگانا اور انہیں کام کی لائن مہیا کرنا مقصود تھا، وہاں ساتھ ہی اس بُعد کو ختم کرنا بھی اس کا مقصود تھا جو دیوبند اور علیگڑھ میں پیدا ہو چکا تھا۔

دیوبند اور علیگڑھ کے لئے پُل ـــــ شیخ الہندؒ

شیخ الہندؒ کا یہ کارنامہ بڑا عظیم ہے کہ انہوں نے ان دو علمی دھاروں کو ملانے کی کوشش کی اور اس جلسہ میں علیگڑھ سے صاحبزادہ آفتاب احمد مرحوم وغیرہ کو بلا کر شامل کیا۔ نہ صرف یہ کیا بلکہ ایک تجویز پاس کرائی کہ ان دونوں درسگاہوں کے طلبہ کا آپس میں تبادلہ ہو۔ چنانچہ اس پر عمل بھی ہوا لیکن افسوس کہ علیگڑھ کے ایک طالب علم "انیس احمد" نے انگریزی اقتدار کے لئے خنجر کا فرض سرانجام دینا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں آئندہ چل کر بڑے نقصانات ہوئے۔ شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال متاثر ہوئی، وہ خود گرفتار ہوئے۔ خطرہ تھا کہ ان دونوں اداروں کے درمیان "ملاپ" کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ ختم ہو کر نہ رہ جائے۔ لیکن اسارت مالٹا کے بعد شیخ الہند نے کمال وسعت قلبی کے ساتھ پھر علیگڑھ کے آزادی خواہ طلبہ کو اتنے زبردست شاباش دی اور اس طرح ان کی خدمات کا اعتراف کیا کہ ایک دنیا ششدر رہ گئی۔

مولانا محمود حسن کا کمال یہ ہے کہ ایک تو انہوں نے اپنے اسلاف و اساتذہ کی روح کو زندہ اور قائم رکھا اور ان کی بتلائی ہوئی راہ پر مسلسل رواں دواں رہے۔ دوسرے انہوں نے ہندوستان کی قریب قریب جملہ ذمہ دار شخصیات اور اداروں سے روابط پیدا کئے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا میاں اصغر حسین اور

ڈاکٹر انصاری مرحوم جیسے حضرات نے بھی جنہوں نے آپ سے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا ہے، سب نے اس بات کی طرف توجہ دلائی۔ ان دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب وقار الملک، علی برادران، حسرت موہانی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، خان عبدالغفار، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالقیوم کانپوری، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا شاہد فاخر الہ آبادی، مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری خلیفہ غلام محمد دین پوری، مولانا تاج محمود امروٹی الغرض سبھی لوگ آپ سے کسی نہ کسی ذریعہ سے متعلق تھے۔ ہندوستان کے اعتبار سے اس صدی کا یہ سب سے مبارک دور تھا کہ مولانا احمد رضا خان کے گھرانے کے علاوہ سارا ہندوستان ایک ساتھ کھڑا تھا اور گویا ہر کسی کا دل ایک ساتھ دھڑک رہا تھا۔

نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی جدید تعلیم یافتہ حضرات کو قرآن کی روشنی سے منور کرنے کی غرض سے آپ نے "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کی داغ بیل ڈالی، جس کے سربراہ مولانا عبیداللہ سندھی قرار پائے تو ان کے معاون مولانا احمد علی لاہوری ـــ اس ادارہ کے دہلی میں معاون مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل اور نواب وقار الملک جیسے لوگ تھے اور اس کی خدمات کا اعتراف مولانا شبلی نے کیا جیسا کہ اس موضوع پہ آج سے ۴ سال قبل انجمن خدام القرآن کے محاضرات میں مولانا عبیداللہ انور رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مقالہ میں واضح کیا تھا۔ پھر شیخ الہند نے مدینہ منورہ سے لے کر کابل تک اور ادھر ترکی کے حکمرانوں تک روابط قائم کئے جس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن انیس احمد صاحب کے بعد ملتان کے ایک خان بہادر نے جو روش اور رویہ اختیار کیا اس کے نتیجہ میں بڑا نقصان ہوا۔ مولانا مکہ معظمہ میں گرفتار ہو کر انگریز حکومت کے اسیر ہو گئے۔ اس موقع پہ ایک اور حقیقت کا انکشاف بھی ضروری ہے وہ یہ کہ سابق صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان مرحوم کے ایک بڑے بھائی جان محمد خان سے بھی حضرت شیخ الہند کی مخبری پہ ایک زمانہ میں مامور رہے، انہوں نے دیوبند میں لکڑی کا ٹال شروع کیا اور شیخ سے رابطہ رکھا۔ ایبٹ آباد کے سابق خطیب مولانا محمد اسحٰق المرحوم نے سردار بہادر خان مرحوم کی موجودگی میں یہ قصہ مولانا مفتی محمود مرحوم کو سنایا اور سردار بہادر خان نے اس کی تصدیق کی۔ جان محمد بعد میں انگریز کے عتاب کا ہی شکار نہ ہوئے بلکہ ہری پور میں اپنے بھائی اکرم خان مرحوم کی گولی کا نشانہ بھی بن گئے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال

شیخ الہند نے جس تحریک ریشمی رومال کی داغ بیل ڈالی تھی وہ اگر کامیاب ہو جاتی تو تاریخ کا ایک بڑا عجوبہ ہوتا لیکن جس طرح حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریک خوانینِ سرحد کی بیوفائی کی بھینٹ چڑھ گئی اس طرح یہ تحریک ملتان کے ایک نواب زادہ اور فیصل آباد کے ایک نوجوان طالب علم کی مخبری کی بھینٹ چڑھ گئی ـــــ شیخ الہند اسارتِ مالٹا سے واپس تشریف لائے تو ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے والا تھا۔ وہ اب بالکل نحیف و نزار تھے لیکن ملّی درد نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ وہ برابر سرگرمِ عمل رہے۔ علیگڑھ جا کر جامعہ ملّیہ کی داغ بیل ڈالی اور اپنے کردار کی عظمت سے ثابت کر دیا کہ اگر علیگڑھ کے بعض عزیزوں نے دانستہ یا نادانستہ مخبری کے فرائض انجام دے کر مجھے تکلیف پہنچائی ہے اور تحریک کو نقصان پہنچایا ہے تو کوئی بات نہیں، میں پھر بھی انہیں سینہ سے لگانے کو تیار ہوں اور "اپنی شاخ" کے حصول کے لئے پھر ان کے دروازہ پر چل کر آیا ہوں ـــــ ساتھ ہی آپ نے تفرقہ بازی کی لعنت سے قوم کو بچانے کی اپنے مخصوص خدّام اور عام لوگوں تلقین کی۔ اسی دور میں وہ بات ہوئی جس کا مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ (کراچی) کے حوالہ سے ذکر آتا ہے کہ آپ نے قرآنی تعلیمات کے عام کرنے اور ان کو پھیلانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس حوالہ یا گفتگو کا یہ مطلب اخذ کرنا کہ پہلے اس طرف ان کی توجہ نہ تھی، اب ہوئی، کسی طرح صحیح نہیں۔ اس سے قبل بھی وہ اسی کوچہ میں مصروفِ کار تھے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب زیادہ قوت و شدت کے ساتھ اس کام کے متمنّی تھے۔ (جاری ہے)

ضرورتِ رشتہ

ایف اے / ڈپلومہ (ڈگار منٹس) ۲۲ سالہ لڑکی کے لیے دینی رجحان کے حامل مناسب رشتہ کی ضرورت ہے۔

سرگودھا سے درمیانہ حیثیت کے اعوان خاندان سے تعلق ہے۔ ذات پات کی قید نہیں، البتہ تنظیم میں شامل صاحبان قابلِ ترجیح ہونگے)

رابطہ کے لیے صرف کوائف ارسال فرمائیں۔

ڈاک کا پتہ:۔ قرآن اکیڈمی ۔ ۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن لاہور، بکس ن ش

Coca-Cola is it!

TRADE-MARK REGD.

"COCA-COLA" AND "COKE" ARE THE REGISTERED TRADE-MARKS WHICH IDENTIFY THE SAME PRODUCT OF THE COCA-COLA COMPANY

caragor

رفتارِ کار

حیدرآباد میں تنظیمِ اسلامی کا سہ روزہ علاقائی اجتماع

الحمدللہ کہ پروگرام کے مطابق تنظیم اسلامی کا اس سال کے دوران سہ روزہ چوتھا علاقائی اجتماع سندھ کے اہم شہر اور قلب حیدرآباد میں ۸ - ۹ اور ۱۰ نومبر کو بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔ اگرچہ شروع میں کچھ دشواریوں اور مسائل کا سامنا تھا لیکن حیدرآباد کے رفقاء کے جذبہ اور لگن اور اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے تمام دشواریاں دور ہوگئیں۔ اس اجتماع کے انعقاد میں کراچی کے رفقاء نے بھی اپنی مقدور بھر کوشش کی۔ اجتماع سے پہلے انتظامات کے سلسلہ میں صلاح و مشورہ کے لئے محترم جمیل الرحمٰن صاحب اور خاکسار کو حیدرآباد جانے کا موقع ملا۔ کراچی تنظیم نے پوسٹرز اور ہینڈ بلز کی طباعت اور مکتبہ کی ذمہ داریوں کو اپنے ذمہ لیا اور ایک ہزار پوسٹرز اور دس ہزار ہینڈ بلز طباعت کروا کر حیدرآباد بھیجے۔ اس کے علاوہ کراچی کے دو رفقاء نے چھ نومبر کو حیدرآباد پہنچ کر حیدرآباد کے رفقاء کی اعانت کی۔ مرکز سے محترم جمیل الرحمٰن صاحب، قمر سعید قریشی صاحب، چوہدری غلام محمد صاحب اور عبدالرزاق صاحب جمعرات ۷ نومبر کی صبح ہی سے حیدرآباد پہنچ گئے تھے۔ اسی طرح کراچی سے مکتبہ لے کر بھائی عبدالرشید صاحب، بھائی محمد صالح صاحب، بھائی ناصر انیس صاحب اور خاکسار جمعرات ہی کو ۸ بجے حیدرآباد پہنچ گئے۔

امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۸ نومبر کو نماز فجر سے قبل بذریعہ ٹرین حیدرآباد پہنچے اور پھر بعد میں مختلف مقامات سے رفقاء اجتماع گاہ پہنچنا شروع ہوگئے۔ کراچی کے رفقاء دو منی بسوں میں اجتماع گاہ پہنچے۔ ان بسوں پر "تنظیم اسلامی کا سہ روزہ علاقائی اجتماع" کا بینر لگایا گیا تھا۔

اس علاقائی اجتماع میں امیر محترم کے تین عمومی خطابات تھے جو تین مختلف مقامات پر رکھے گئے تھے جبکہ رفقاء کے لئے تربیتی پروگرام کا انتظام محترم عبدالقادر صاحب امیر تنظیم اسلامی حیدرآباد کی فیکٹری (جو اب بند پڑی ہے) میں تھا۔ رفقاء کے لئے اجتماعی رہائش و مسجد کا انتظام بھی وہیں کیا گیا تھا۔ فیکٹری کے مرکزی دروازہ پر اھلاً وسھلاً کا خوبصورت بینر آویزاں کیا گیا تھا۔ دروازہ میں داخل ہونے کے بعد دفاتر کے برآمدے میں استقبالیہ کاؤنٹر لگایا گیا تھا۔ جہاں شرکاء اپنے نام اور تنظیم کا تعارفی بیج حاصل کرتے تھے۔ وہیں پر اجتماع سے متعلق بہت ہی مفید ہدایات درج تھیں اور تربیتی پروگرام کے نظام الاوقات بھی آویزاں تھے۔ اجتماع گاہ کے اندر قرآنی آیات کے بینر لگائے گئے تھے۔

اجتماع کا آغاز حیدر آباد کی ایک اہم جامع مسجد قبا پیر آباد میں خطاب جمعہ سے ہوا۔ اس میں امیر محترم نے حکمت و احکام جمعہ کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ امیر محترم نے خطبۂ جمعہ کو حزب اللہ کا ہفتہ وار اجتماع قرار دیا جس کا اصل مقصد تذکیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ جمعہ میں خطبہ جمعہ کو ذکر قرار دیا گیا ہے۔ امیر محترم نے فرمایا کہ قرآن حکیم دراصل مسلمانوں کی نظریاتی اور انقلابی جماعت کا بنیادی لٹریچر ہے۔ اور خطبۂ جمعہ کا مقصد یہ ہے کہ اس بنیادی لٹریچر یعنی قرآن حکیم کے ذریعے سے مسلمانوں کی جماعت کو ان کا اصل مقصد اور نظریہ کی یاد دہانی کرائی جائے۔ اس خطبہ کی اتنی اہمیت ہے کہ ظہر کی چار رکعت فرض نماز کی جگہ دو رکعت فرض رہ گئیں اور دو رکعت کی جگہ خطبہ قائم مقام ہو گیا اور خطبہ کی اذان سے نماز کے ختم ہونے تک کاروبار دنیوی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

۸ نومبر جمعۃ المبارک کی شام سوم اسٹیٹڈ ہال کے سبزہ زار میں تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام وہ عظیم الشان جلسہ ہوا جس کی مثال حیدر آباد کے رفقاء کے مطابق ماضی میں نہیں ملتی۔ جلسہ گاہ اپنی بھرپور وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی۔ اگرچہ انتظام کرسیوں کا تھا لیکن وہ ناکافی ہو گئیں اور مزید دریوں کا اہتمام کرنا پڑا۔ اس کے باوجود بھی حاضرین کی ایک بڑی تعداد نے کھڑے ہو کر امیر محترم کا خطاب سنا۔ اس خطاب کا عنوان تھا "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا؟ اور کیوں؟" امیر محترم کا خطاب رات نو بجے شروع ہوا اور پونے ۱۱ بجے تک جاری رہا۔ امیر محترم نے فرمایا کہ اگرچہ اسلامی انقلاب کی اصطلاح قرآنی اصطلاح نہیں لیکن جدید ذہن کے قریب ہونے اور ابلاغ کے لئے اس اصطلاح کا استعمال ضروری ہے جبکہ قرآن میں اس کے لئے چار اصطلاحات ہیں (۱) تکبیر رب (۲) اقامت دین (۳) اظہار دین (۴) وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ۔ اور ان کا مقصد اور مفہوم ایک ہی ہے۔ اسلامی انقلاب کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلامی نظام کے تین شعبے ہیں نمبر ایک: سماجی نظام، اس میں کامل مساوات، فضیلت تقویٰ کی بنیاد پر مخلوط معاشرہ کی نفی اور عصمت و عفت کی حفاظت۔ اس کے نمایاں اوصاف ہیں ـــــ نمبر ۲: معاشی نظام، امانت کا تصور، ملکیت کی نفی اور کفالت عامہ کا تصور اس کے اہم خدوخال ہیں ـــــ نمبر ۳: سیاسی نظام: یعنی حاکمیت صرف اللہ کی اور خلافت عامہ کا تصور کہ تمام مسلمان اجتماعی طور پر اللہ کے خلیفہ ہیں۔ اور ایسا نظام جس میں حریت مساوات اور اخوت ہوں۔ دوسرے سوال کے جواب میں کہ اسلامی انقلاب کیوں؟ امیر محترم نے فرمایا کہ یہ ہمارا دینی فریضہ ہے، ایمان کا تقاضا ہے؛ اور آخرت کے عذاب سے بچنے کے لئے لازم ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ خاص طور پر مسلمانان پاکستان کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ پاکستان کے قیام کا جواز اسلام کے سوا کوئی نہیں۔ اگر اس

ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں ہوتا تو یہ اس کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔ ہم نے اس کے لئے اللہ سے وعدے کئے ہیں کہ یہاں پر اسلام کو نافذ کریں گے تو اگر ہم اس وعدہ کو پورا نہیں کرتے تو اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔

تیسرا خطاب عام امیر محترم کا جامع مسجد دارالعلوم لطیف آباد نمبر ۱ میں بعد نماز عشا ہوا۔ اس میں آپ نے گذشتہ خطاب کا خلاصہ بیان کیا اور "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیسے؟" کے عنوان پر خطاب کیا۔ جامع مسجد کا وسیع و عریض ہال بھرا ہوا تھا اور مسجد سے باہر بھی حاضرین موجود تھے اور امیر محترم کا خطاب بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ امیر محترم نے فرمایا کہ اس کے لئے ایک اسلامی انقلابی جماعت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے آپ نے تین مراحل کا ذکر فرمایا (۱) تبلیغ و دعوت (۲) تنظیم (۳) تربیت و تزکیہ ـــــ یہ ابتدائی مراحل ہیں اور اس کے بعد تین اگلے مراحل (۱) عدم تشدد یا صبر محض (۲) اقدام (۳) مسلح تصادم ـــــ امیر محترم نے فرمایا کہ اسلامی انقلاب کے یہ چھ مراحل ہیں نے سیرت النبیؐ سے اخذ کئے ہیں۔ آپ نے سیرت النبیؐ کا ایک خاکہ پیش فرمایا کہ آپؐ کی جدوجہد ان چھ مراحل سے گزری ہے۔ لیکن مسلمان معاشرہ میں اقدام کے مرحلے کو بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس میں منکرات کے خلاف حکومت کو چیلنج کرنا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم ایک منکر کے بعد دوسرے منکر کے خلاف مظاہرہ کریں گے اور یہ جب ہی ہو سکے گا جب معاشرہ میں اجتماعی ارادہ (Collective Will) پیدا ہو جائے گی۔

۱۰ نومبر کی شام عصر کے بعد امیر محترم نے سوال و جواب کی نشست میں حاضرین کے سوالات کے تسلی بخش جوابات دیئے۔ ایک خصوصی نشست ۹ نومبر بروز ہفتہ بعد نماز عصر امیر محترم کے ساتھ ہوئی جس میں سندھ یونیورسٹی کے پروفیسرز اور اعلیٰ علمی شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا۔ ایک پروفیسر نے اس ملاقات کے بعد اپنا تاثر ان الفاظ میں فرمایا کہ ماشاءاللہ ڈاکٹر صاحب چلتا پھرتا علمی سرمایہ ہیں ـــــ

دن کے تربیتی پروگرام میں جو نظام الاوقات مقرر کئے گئے تھے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) روزانہ بعد نماز فجر آدھ گھنٹہ۔ مختار حسین فاروقی صاحب کا خطاب

(۲) ۶-۳۰ بجے تا ۸-۳۰ بجے صبح۔ ناشتہ اور دیگر حوائج ضروریات سے فراغت

(۳) ۸-۲۰ بجے تا ۱۰-۳۰ بجے تربیتی پروگرام

(۴) ۱۰-۳۰ بجے تا ۱۱ بجے دقفہ چائے
(۵) ۱۱ بجے تا ۱ بجے دوپہر تربیتی پروگرام
(۶) ۱ بجے تا ۲-۱۵ بجے نمازِ ظہر، کھانا، قیلولہ وغیرہ
(۷) نمازِ عصر تا نمازِ مغرب تعارف رفقاء

ہفتہ ۹ نومبر کو بعد نمازِ فجر رفیقِ تنظیم جناب مختار حسین فاروقی صاحب نے صحابہ کی سیرت کا مطالعہ کرنے پر زور دیا کہ صحابہ کی جماعت میں مختلف طبائع کے اصحاب تھے تو جو کوئی بھی کسی صحابی سے اپنی طبیعت سے مناسبت پائے وہ ان کی اتباع اور پیروی کر کے ان سے قریب تر پہنچنے کی کوشش کرے۔ صحابہ کی مثال ستاروں کی مانند ہے اور جو کوئی بھی ان میں سے کسی کی پیروی کرے ہدایت کو پہنچ جائے گا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر رفقاء ۸-۳۰ بجے اجتماع گاہ میں جمع ہو گئے جو رہائش گاہ سے متصل ہی تھی تعلیمی و تربیتی پروگرام کا آغاز ہوا تو کراچی کے رفیق ضمیر اختر صاحب نے منتخب نصاب نمبر ۲ کے پہلے تین دروس کی تلاوت کی۔ اسد الرحمٰن فاروقی صاحب نے پہلے درس کا خلاصہ اور دوسرا مکمل درس تقریباً ایک گھنٹے میں بیان کیا۔ آپ نے نہایت جامع انداز میں اقامتِ دین کی فرضیت کو واضح کیا۔ تیسرا درس چوہدری غلام محمد صاحب قیم تنظیم اسلامی نے دیا۔ آپ نے اپنے مخصوص لہجے میں ایک دشوار موضوع کو دل نشیں پیرائے میں بیان کیا اور قرآنی آیاتِ بیّنات کی روشنی میں بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں اسلامی انقلاب کے لئے آخری عنوان یعنی نہی عن المنکر اور محافظت حدود اللہ کے ضمن میں طاقت کا مظاہرہ اور چیلنج کو کھول کر بیان کیا۔

آدھ گھنٹے کے لئے چائے کا وقفہ ہوا۔ ۱۱ بجے پھر اجتماع کی کارروائی شروع ہوئی۔ محترم عبدالرزاق صاحب نے درس چہارم کے ذیل میں اقامتِ دین کا کام کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف پر شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا، درس پنجم پھر چوہدری غلام محمد صاحب نے دیا۔ آپ نے اپنے مخصوص طرزِ استدلال کے ذریعے حزب اللہ کی تشکیل میں فیصلہ کن عامل بمقابلہ حزب الشیطان پر روشنی ڈالی۔

آخر میں چھٹا درس ضمیر اختر صاحب نے دیا۔ آپ نے اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کی ہیئت ترکیبی اور تنظیمی اساس پر متعلقہ منتخب آیات کی روشنی میں بیان کیا۔

آپ نے بیعت کی اصل قرآن میں اور پھر دورِ نبوت اور دورِ خلافتِ راشدہ میں اس پر عمل کو تاریخی حوالے سے واضح کیا۔ نیز مختلف ادوار میں اس کی نوعیت پر روشنی ڈالی۔

اتوار ۱۰ نومبر کو بعد نماز فجر حسب سابق محترم مختار حسن فاروقی صاحب نے گزشتہ مضمون کو مکمل کیا۔ ناشتے وغیرہ کی فراغت کے بعد ٹھیک ۸:۳۰ بجے رفقاء اجتماع گاہ میں جمع ہو گئے۔ درس ہفتم سے چوہدری غلام محمد صاحب نے آغاز کیا۔ آپ نے نظم جماعت کی پابندی اور اس سے رخصت و معذرت کے معاملے کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا۔

درس ہشتم رفیق محترم اسد الرحمان فاروقی صاحب نے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ آدھ گھنٹے میں مکمل کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بھائی اسد الرحمان کو قوتِ بیان سے نواز رہا ہے۔ آپ نے مربوط انداز میں اطاعت امیر بمقابلہ تنازع فی الامر و نجوی کو متعلقہ آیات کی روشنی میں واضح کیا۔

درس نہم محترم عبد الرزاق صاحب نے دیا اور مختصر وقت میں امراء کا رفقاء کے ساتھ طرزِ عمل اور اسوہ رسول ﷺ پر مدلل خطاب فرمایا۔ اس طرح تربیتی درس کا یہ سلسلہ مکمل ہوا۔ چائے کے وقفہ کے بعد امیر محترم نے دو روزہ درسِ قرآن کے بارے میں سوالات کے جوابات دیئے۔ یہ سلسلہ نمازِ ظہر تک جاری رہا۔ نمازِ ظہر کے بعد چھ افراد نے امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر سمع و طاعت اور جہاد پر مبنی بیعت کی۔ اللہ ان حضرات کو اپنے دین کا خادم بنائے۔ نمازِ ظہر کے بعد یہ سہ روزہ علاقائی اجتماع اپنے اختتام کو پہنچا۔

اخیر میں حیدر آباد کے رفقاء کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنہوں نے اجتماع کے انعقاد کے سلسلے میں ان تھک محنتیں کیں اور میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ نوجوان رفقاء میں سے غیاث صاحب، اسلم صاحب، اعجاز صاحب، شاہد صاحب، عبد الحسیب غوری صاحب اور بزرگ رفقاء محمد حنیف صاحب، عبد الشکور صاحب اور امین الدین صاحب نے نہایت جانفشانی سے کام کیا۔ علاوہ ازیں ایسے تمام رفقاء جنہوں نے کسی بھی اعتبار سے حصہ لیا ہے۔ ان کا اجر اللہ کے یہاں محفوظ ہے۔

قابلِ مبارک باد ہیں حیدر آباد تنظیم کے امیر جناب عبد القادر صاحب جنہوں نے اپنے مستعد رفقاء کے تعاون سے تمام مراحل کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کے لئے ایسے ہی جذبات سے نوازے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

مرتب: سید واحد علی رضوی
امیرِ وسطی تنظیم اسلامی کراچی

(1126)

نبی اکرم کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ :

کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں ؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اِس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

ھدیۃ فی نسخۃ : تین روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یکصد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا :

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

MONTHLY "MEESAQ" LAHORE

Vol. 34 | DECEMBER 1985 | No. 12

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :

5-C, 5th FLOOR, SIDCO AVENUE CENTRE
264-R. A. LINES, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE.
TELEPHONE : 870512 880731